دسمبر 2007

قیمت: -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

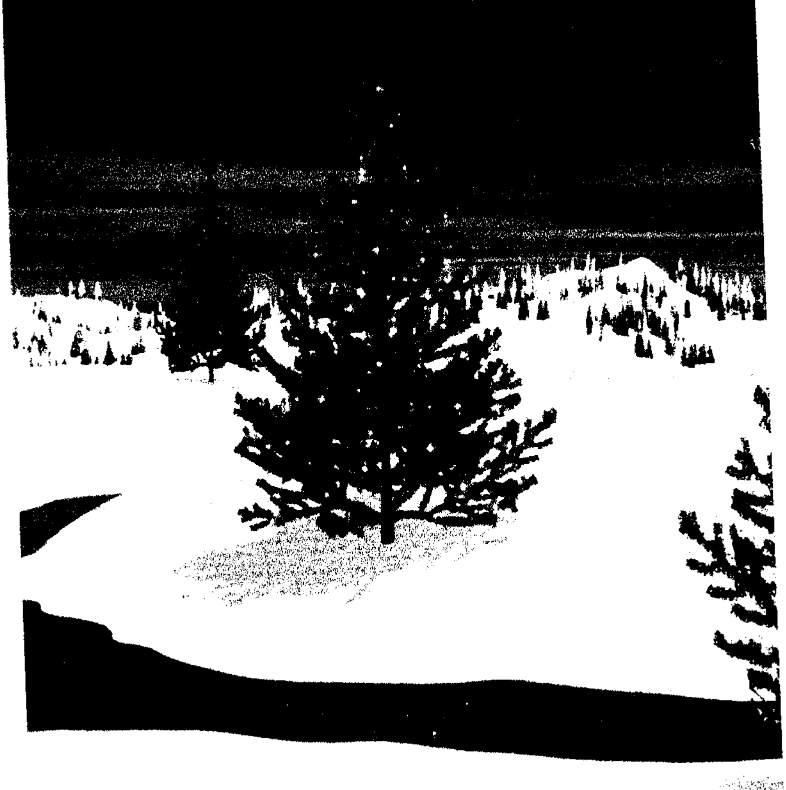

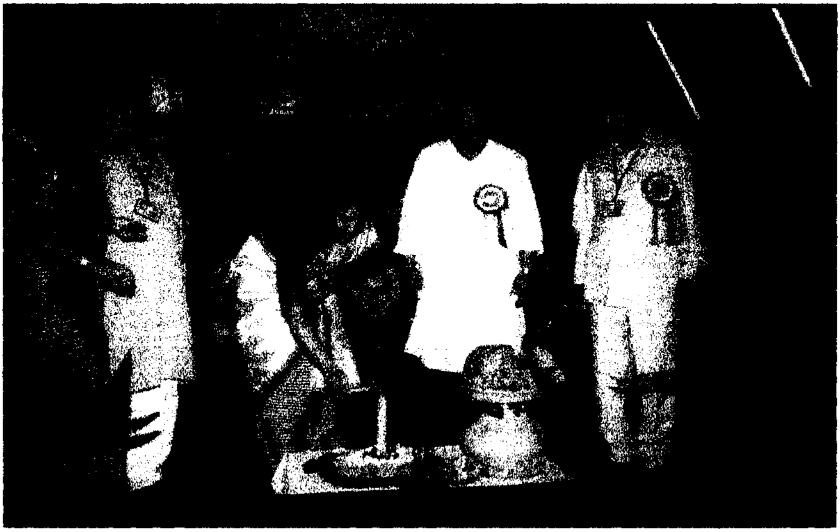

محترمہ ڈی. پورن دیسوری منسٹر آف اسٹیٹ، ایچ آر ڈی، شمع روشن کرتے قومی اردو کونسل کی طرف سے منعقدہ سہ روزہ سیمینار "اردو شاعری پر میر کے اثرات" کا افتتاح کرتے ہوئے۔

محترمہ ڈی. پورن دیسوری افتتاحی تقریر فرما رہی ہیں۔

محترمہ ڈی. پورن دیسوری نے اس موقع پر شائع ہونے والے سووینیر کا اجرا بھی کیا۔ تصویر میں ان کے علاوہ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید،
منی پور کے وزیر تعلیم جناب جینت کمار اور جناب نارا سنگھ بھی نظر آرہے ہیں۔

محترمہ ڈی. پورن دیسوری کے ساتھ ڈاکٹر علی جاوید، جناب جینت کمار، جناب نارا سنگھ اور دیگر اہم شخصیات۔

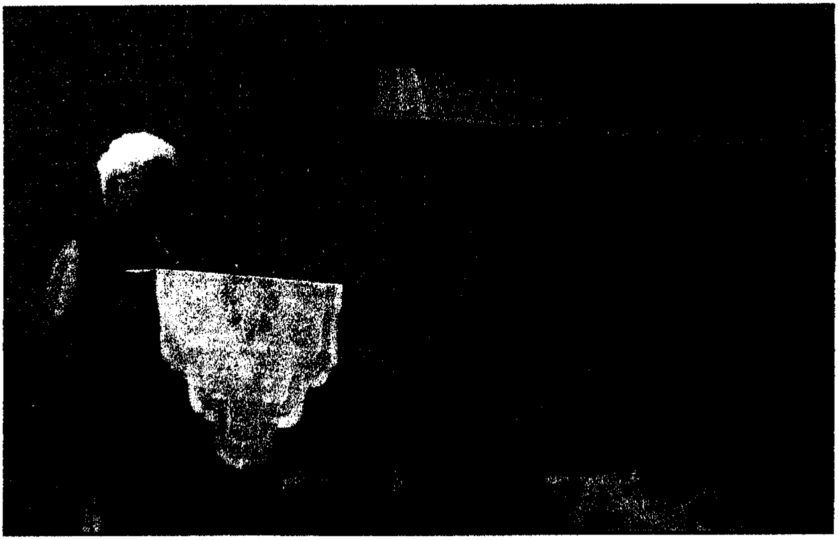

ڈاکٹر علی جاوید نے افتتاحی اجلاس میں خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔

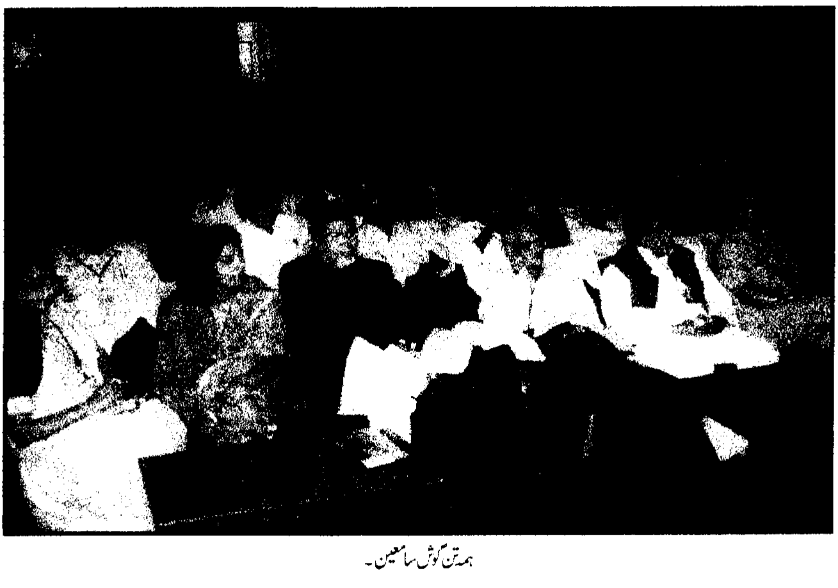

ہمہ تن گوش سامعین۔

سیمینار میں ملک کے نامور محققین اور ناقدین نے شرکت کی۔
اپنے مقالے پڑھتے ہوئے چند شرکا

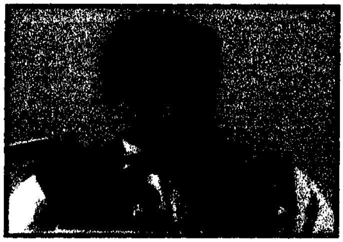

پروفیسر لطف الرحمن

پروفیسر قمر رئیس

پروفیسر شمیم حنفی

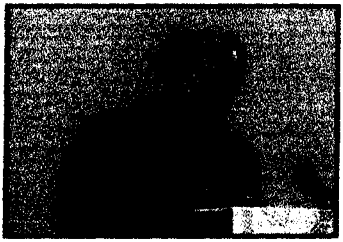

پروفیسر انیس اشفاق

پروفیسر علی احمد فاطمی

ڈاکٹر خواجہ اکرام

ڈاکٹر شین. اختر

ڈاکٹر احمد محفوظ

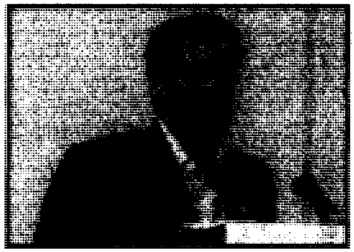

ڈاکٹر سراج اجملی

ڈاکٹر نجمہ رحمانی

ڈاکٹر فرحت رضوی

ڈاکٹر تارا سنگھ

کلچرل پروگرام میں قوالی بھی رکھی گئی جو بہت پسند کی گئی

ماہ نامہ
اردو دنیا نئی دہلی
جلد۔9، شمارہ۔12 دسمبر 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26108159, 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، پتھر ڈفلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ...... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ...... ادارہ 3

زبان و تعلیم

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف ...... شمس الرحمٰن فاروقی 4
● اردو کی ترویج و ترقی کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ...... عزیز احمد 7
● اردو تحریر کی تدریس ...... انیس چشتی 10
● دور بکھرے دیہی علاقوں میں اردو پرائمری تعلیم ...... ایم آئی. ساجد 12
● برصغیر میں فاصلاتی تعلیم کا دائرہ ...... ریاض احمد 16

ادب و صحافت

● منظر کاظمی کے افسانے ...... شمس الرحمٰن فاروقی 19
● شاعری کا ترجمہ: چند عملی مسائل ...... ف. س. اعجاز 22
● کس بھول کو اوڑھے سوتی ہو ...... بشریٰ اعجاز 28
● ناقابل فراموش چار دن (رپورتاژ) ...... نکہت پروین 30

روبرو

● اقبال مجید سے بات چیت ...... وسیم اختر 36

صحت، ماحولیات اور سائنس

● ڈرگ کمپنیاں پھیلا رہی ہیں خطرناک ٹی. بی ...... بھرت جھن جھن والا 39
● کیا ہے سیتو سمدرم پروجیکٹ ...... شوبہ دویدی 40
● ماحولیاتی حدت اس صدی کا سب سے بڑا چیلنج ...... فخر الدین وحید 41
● ہندوستانی مردم شماری کا پس منظر ...... ایس. ایس. رضا 43

کیریئر

● لیب ٹیکنیشین کے لیے روزگار کے مواقع ...... زبیر احمد بھاگلپوری 45
● کمپیوٹر کمپوزنگ بمقابلہ خطاطی ...... مختار ٹونکی 47

ہماری مطبوعات سے

● کہاں گئے وہ لوگ ...... سیّد محمد مہدی 49
اردو خبرنامہ ...... ادارہ 53
تبصرہ و تعارف ...... کتابوں پر تبصرے 73

بچوں کا گوشہ

● پرندے کہاں گئے ...... جلیل عشرت 79

آپ کی بات

■ **سیدہ انجم فریدی، 36-1/135، بی. پی. جے. بلاک، نیوسیلم پور، دہلی**

نومبر 2007 کا ماہ نامہ ''اردو دنیا'' موصول ہوا۔ عید اور دیوالی کے رنگوں سے مزین ڈسٹ کور کو دیکھ کر ہی خوشگوار مسرت کا احساس ہوا۔ اندرون رسالہ سب سے پہلے میں ''ہماری بات'' پڑھتی ہوں اور ہمیشہ ایک نئی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس بار بھی آپ نے اردو زبان کی بنیادی خوبیوں کو جس محققانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ بات کرتے کرتے آپ جس طرح اردو زبان سے متعلق خدشات کا اظہار کرتے ہیں ان خدشات سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کا تدارک کیونکر ہو۔ رسائل و جرائد کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے لیکن صحت زبان کی فکر کسی کو نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی مقبولیت میں صحت الفاظ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آپ کا رسالہ اس سلسلے میں سب سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ محترم فاروقی صاحب کا مستقل کالم اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' اس سلسلے میں اردو والوں کی بڑی رہنمائی کر رہا ہے۔

تازہ شمارے کے دیگر مشمولات بھی قابل توجہ ہیں۔ خاص طور پر عینی آپا سے نمائندہ فانا کی بات چیت۔ گیان چند جین پر مضمون بھی خاصے کی چیز ہے۔ آپ کے ادارے سے ان پر اور بھی کچھ مضامین شائع ہونے چاہئیں کیونکہ محترم گیان چند جین نے اردو تحقیق میں بے مثال کام کیے ہیں۔

رسالے کی صحت کے لیے مسلسل دعا گو ہوں۔

■ **صغیرہ بیگم، معرفت مولوی نصیر احمد، ساکن خیروا، ڈھاکہ، مشرقی چمپارن، بہار-845418**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' کے شمارے ہر مہینے وقت پر مل جاتے ہیں۔ آپ کی مجلس ادارت قابل مبارک باد ہے کہ رسالہ دن بہ دن ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ عصری تقاضوں سے باخبر رکھنا آپ کے اس رسالے کی انفرادی شناخت ہے۔

نومبر 2007 کا شمارہ ابھی میرے مطالعے میں ہے۔ اداریے میں اردو ہندی کے رشتے اور اردو زبان کی انفرادی شناخت سے متعلق آپ نے جو باتیں کہی ہیں وہ ہم قارئین کے لیے واقعی قابل غور ہیں۔ کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' کا مطالعہ پابندی سے کر رہی ہوں۔ اس کالم میں فاروقی صاحب کی عالمانہ رائیں ہم جیسے طلبہ کے لیے مشعل راہ ہیں۔

عینی آپا کا مضمون ''کچھ اپنے بارے میں'' ان کے ادبی سفر اور شعور و ادراک کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔ عینی آپا کا یہ بالیدہ خیال کہ آدمی کو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہنا چاہیے اچھا لگا اور دوسری بات جو وہ ویمنز لب کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ ''جہاں تک عورتوں کی ذہنی اور اقتصادی آزادی اور حقوق اور ہمسری اور خودداری کا تعلق ہے، میں ویمنز لب کے ساتھ ہوں مگر اس تحریک کی اخلاقی بے راہ روی کی مخالف اور اس سلسلے میں ہمیشہ مولوی'' آج کی خواتین کے لیے سبق آموز ہے۔ قرۃ العین حیدر کی اسی فکر نے انھیں ہمارے بیچ عینی آپا بنایا ہے۔

اردو دنیا کے اس شمارے کے دیگر مضامین میں ''اردو صحافت کا ابتدائی دور'' از شاہد پرویز، ''اردو درس و تدریس چند تلخ حقائق'' از راجیش مشرا، ''گردش رنگ چمن'' از سلام بن رزاق، ''بدلتا ہوا ماحولیاتی نظام اور ہم'' از عبید الرحمٰن، ''مطالعۂ زبان اور کمپیوٹر'' از صباح الدین احمد اور ''اردو تحقیق و تنقید اور گیان چند جین'' از عبدالرب کے ساتھ نمائندہ فانا سے قرۃ العین حیدر کی بات چیت بیحد پسند آئے۔ لطف الرحمٰن، نجمہ رحمانی اور ابوبکر عباد کے تبصروں نے متاثر کیا۔ ہماری تمنا ہے کہ یہ پرچہ ہم جیسے طلبہ کی ضرورتوں کو اسی طرح پورا کرتا رہے۔

■ **محمد کمل حسین، رانچی یونیورسٹی، رانچی، جھارکھنڈ**

''اردو دنیا'' کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ حسب معمول میں نے اول سے آخر تک مطالعے سے دل کو سکون بخشا اور اپنے علم میں اضافہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ رسالہ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ آمین

■ **نفیس بانو، ریڈر، شعبۂ اردو، وسنت کالج، راج گھاٹ، وارانسی**

''اردو دنیا'' پابندی سے مل رہا ہے۔ ''اچھی اردو، روزمرہ، محاورہ، صرف'' کا کالم وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کر رہا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو مبارکباد۔

■ **انیس چشتی، 116 اسٹرلنگ ہاؤس، 1984 کونوینٹ اسٹریٹ، پونہ**

بالمشافہ نہ سہی اس خط کے ذریعے نصف ملاقات کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ این. سی. پی. یو. ایل. میں آپ کی تشریف آوری اردو کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے۔ ''اردو دنیا'' کے ذریعے ادارے کی سمت و رفتار اور آپ کی فعالیت کا علم ہوتا رہتا ہے۔ پرچے کے مشمولات کے تعلق سے صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسے ایک عالمی سطح کا معیاری پرچہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے اسے تنقید کی بجائے توازن کی ڈگر پر قائم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ہر شخص اپنا پرچہ سمجھتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے ہم کسی بھی زبان کے فروغ کا حق بہترین طریقے سے ادا کر سکتے ہیں۔

□□□

ہماری بات

اردو ہندوستان کی ایک ایسی زبان ہے جس کے سمجھنے والے اور بولنے والے ملک کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اردو جس کا پہلا گہوارہ شمالی ہند تھا، اس نے ملک گیر مقبولیت اپنے کن اوصاف کی بنا پر حاصل کی اور ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود جو بعض حلقوں کی طرف سے مسلسل کی جاتی رہیں، اس کا دائرۂ اثر کس طرح وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا رشتہ ہندوستان کی مٹی سے بہت گہرا اور محکم ہے۔ جس طرح ہندوستان نے آریاؤں کی آمد سے آج تک اپنی کھڑکیاں تازہ ہواؤں کے لیے ہمیشہ کھلی رکھی ہیں، اسی طرح اردو نے اپنی ابتدا سے مختلف زبانوں کے اثرات کھلے دل سے قبول کیے ہیں اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پچھلے شمارے میں بھی کہا تھا اس عمل کی افادیت اپنی جگہ، اس کی پذیرائی غیر مشروط طور پر نہیں ہونی چاہیے۔ اس عمل میں اگر اردو کی اصل شکل وصورت ہی مسخ ہو جانے کی نوبت آجائے تو اس پر روک لگانا ضروری ہے۔

دلی کو ملک کی ہی نہیں، اردو کی بھی راجدھانی کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کی ابتدائی پرورش و پرداخت اسی شہر میں ہوئی۔ گلی کوچوں سے اکتساب فیض کرتے ہوئے شاہی دربار تک رسائی کا موقع بھی اسے یہیں ملا۔ اردو کے حوالے سے دلی کی مرکزی حیثیت آج بھی قائم ہے۔ یہاں اردو کے بڑے بڑے ادارے سرگرم کار ہیں۔ بڑے بڑے اشاعت گھر ہیں جو ہر سال بہت بڑی تعداد میں کتابیں چھاپتے ہیں اور یہ ہندوستان بھر میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی فروخت ہوتی ہیں۔ یہاں سے بہت سے سہ ماہی، دو ماہی اور ماہانہ رسالے نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ پندرہ روزہ اور ہفت روزہ اخبارات کے ساتھ روزناموں کی بھی بڑی تعداد ہے جن میں سے بعض کا حلقۂ اشاعت بہت وسیع ہے اور دلی کے علاوہ ملک کے دوسرے کئی شہروں سے بھی ان کے ایڈیشن نکلتے ہیں۔ اردو اخبارات کی یہ کثیر الاشاعتی اردو کے حق میں ایک نیک شگون ہے کہ اردو کی کس مپرسی کے تمام شور و غوغا کے باوجود اردو قارئین کی تعداد گھٹ نہیں رہی، بڑھ رہی ہے۔

لیکن ان اخبارات میں جس طرح کی زبان استعمال ہو رہی ہے اس میں علاقائی اثرات اتنے حاوی ہو گئے ہیں کہ اردو کا مانوس و مروج لہجہ بری طرح مجروح ہو رہا ہے۔ اس عمل پر روک متعلقہ اخبارات کے ذمے داران ہی لگا سکتے ہیں۔ انھیں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اپنے کارکنوں کی لسانی تربیت کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکالنی چاہیے۔ اس سے ان کے اخبارات کی ساکھ بھی بڑھے گی اور یہ اندیشہ بھی دور ہو سکے گا کہ اخبار بیں طبقہ تیزی سے رائج ہوتی اس غلط زبان ہی کو صحیح زبان نہ سمجھنے لگے اور اردو اپنے لب ولہجہ کی جس چاشنی اور نفاست کے لیے پہچانی جاتی ہے، وہ اس سے محروم ہو جائے۔

●

پچھلے دنوں قومی اردو کونسل نے منی پور کی راجدھانی امپھال میں میر تقی میر پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ اردو کے نام نہاد روایتی مراکز سے دور اس سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کونسل کا ایک جرأت مندانہ اقدام تھا۔ یہ سیمینار غیر معمولی طور پر کامیاب ہوا اور ایک ایسے خطے میں جہاں اردو جاننے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اردو اور اس کے شعر و ادب کے ساتھ جو دلچسپی دیکھنے میں آئی وہ حوصلہ افزا بھی تھی اور اس اعتبار سے چشم کشا بھی کہ جن علاقوں کو اردو کا مامن و مرکز سمجھا جاتا ہے وہاں کے لوگ اپنی زبان کے تئیں کس قدر بے حس اور بے پروا ہو گئے ہیں۔ سیمینار کی مفصل رپورٹ اس شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔ کاش اسے پڑھ کر روایتی اردو والوں کی رگ حمیت کچھ پھڑکے۔ آئندہ شمارے میں ہم سیمینار کی مہمان خصوصی محترمہ پورن دیسوری کی وہ تقریر بھی شائع کریں گے جو انھوں نے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں کی تھی۔ ان کی تقریر نہ صرف اردو سے ان کے دلی تعلق کی آئینہ دار تھی بلکہ اس کی لسانی اہمیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالتی تھی۔

●

محترمہ جمیلہ فاروقی کا انتقال پوری اردو دنیا کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ وہ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور اردو کے ممتاز محقق، ناقد، ادیب اور شاعر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی شریک حیات ہی نہیں شریک کار بھی تھیں۔ فاروقی صاحب کے علمی ادبی کاموں میں انھوں نے ہمیشہ معاونت کی۔ ماہنامہ ''شب خون'' کی بیشتر ذمے داریاں تو وہ اس رسالے کے آغاز ہی سے سنبھالے رہیں اور اس رسالے نے اردو کی ادبی صحافت میں جو عہد آفریں کردار ادا کیا، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ انھیں لڑکیوں کی مناسب تعلیم و تربیت سے بھی گہری دلچسپی تھی اور یہ اہم کام بھی وہ تن دہی اور تسلسل سے انجام دیتی رہیں۔ دوران علالت بھی وہ اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ تھیں۔ خدا انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور فاروقی صاحب کو اور خاندان کے دیگر افراد کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: اردو میں اگر ''خوان'' کا تلفظ ''خان''، ''خواب'' کا ''خاب'' اور ''خواجہ'' کا ''خاجہ'' ہوتا ہے تو ''خواتین'' کا تلفظ ''خاتین'' کیوں نہیں ہوتا؟ مہربانی کر کے وضاحت فرمائیں۔

جواب: ''خوان'' اور'' خواجہ'' جیسے الفاظ میں جو واؤ ہے اس واؤ کو معدولہ کہتے ہیں، جس کے معنی میں پہلے بتا چکا ہوں یعنی وہ واؤ جسے دبا کر برابر کر دیا گیا ہے۔ ایسی واؤ صرف فارسی کے الفاظ میں آتی ہے۔ ترکی لفظ'' خاتون'' کی جمع ''خواتین'' عربی کے طرز پر بنائی گئی ہے، جیسے ''مجذوب'' کی جمع ''مجاذیب''۔ عربی کی طرز پر کبھی کبھی لفظ ''خان'' کی جمع'' خوانین'' اور'' خاقان'' کی جمع'' خواقین'' بنائی جاتی ہے۔ ان میں بھی واؤ معدولہ نہیں ہے۔

سوال: جو لوگ گذر چکے ہیں ان کے نام کے آگے پیچھے'' مرحوم'' کے ساتھ ساتھ'' جناب'' یا'' صاحب'' کا لفظ لکھنا درست ہے کہ نہیں؟

جواب: جو لوگ اس دنیا سے گذر چکے ہیں ان کے نام کے ساتھ'' مرحوم'' عام طور پر لکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ'' جناب'' یا'' صاحب'' بہت کم لکھا جاتا ہے۔ اگر لکھتے بھی ہیں تو عام طور پر ایسے لوگوں کے لیے جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہو (ان کے انتقال کے بعد کی مدت مثلاً بہت سے بہت بیس سال ہو)۔ عام طور پر'' جناب''،'' صاحب'' کو لفظِ'' مرحوم'' کے ساتھ لکھتے ہیں تو یہ انداز بھی اختیار کرتے ہیں کہ جن صاحب کا ذکر کیا جا رہا ہے ہم یا ہمارے پڑھنے اور سننے والے عام طور پر ان سے ذاتی طور پر واقف ہیں یا رہے ہوں گے۔ انگریزی میں فقرہ The Late بھی اسی قسم کا ہے۔ اسے ہر مرے ہوئے شخص کے نام کے ساتھ لکھ سکتے ہیں لیکن یہ خیال رکھتے ہیں کہ جس شخص کے نام کے ساتھ The Late لکھا جا رہا ہے اس کا انتقال پندرہ یا بیس سال کے اندر ہی ہوا ہو۔

(سوالات: از ملک احسان احمد، لکھنؤ)

سوال: طوطا یا توتا میں کون سا لفظ درست ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے تو اپنی مرتب کردہ لغت میں اسے توتا لکھا ہے۔

جواب: ''طوطا'' اردو میں اس چڑیا کو کہتے ہیں جسے انگریزی میں Parrot اور فارسی میں'' طوطی'' کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا مروج املا'' طوطا'' ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ چونکہ یہ فارسی یا عربی لفظ نہیں ہے، لہٰذا اس میں ط کا حرف نہیں آنا چاہیے، یہ تجویز کیا کہ اسے ت سے (توتا) لکھا جائے۔ لیکن جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں، زبان کے بارے میں قیاس نہیں چلتا۔ زبان کی بنیاد رواج اور استعمال عام پر ہوتی ہے۔ اس لیے'' طوطا'' میں ط ہی درست ہے۔ اسے بدلنے کی کوشش طالب علموں کے لیے الجھن پیدا کرے گی۔ میں اس کے حق میں بالکل نہیں ہوں۔

سوال: ''مدت'' اور'' عرصہ'' میں کون سا لفظ کب استعمال کرنا درست ہے؟ ''مدت خریداری'' تو لکھا جاتا ہے مگر'' عرصۂ خریداری'' لکھا ہوا دیکھنے میں نہیں آتا۔ کیا دونوں کے استعمال میں وقت/ مدت بھی مقرر ہے؟

جواب: لفظ'' عرصہ'' کو اردو والے'' مدت'' کے لیے استعمال کرتے ہیں، اگرچہ عربی/ فارسی میں یہ معنی نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں بعض بعض ترکیبیں دونوں طرح درست مانی جاتی ہیں، مثلاً'' مدتِ عمر/ عرصۂ عمر''،'' مدت حکومت/ عرصۂ حکومت''۔'' مدتِ خریداری'' کی ترکیب اردو والوں نے بنائی ہے اور یہی درست ہے۔ یہاں پر'' عرصۂ خریداری'' لکھا جائے تو غلط نہ ہوگا لیکن خلاف محاورہ ہوگا۔

سوال: ''سنہرے اصول'' اور'' سنہری اصول'' میں کس لفظ کا استعمال صحیح ہے؟ اسی طرح،'' امام'' اور'' پیش امام'' میں کون درست ہے؟

جواب: بعض الفاظ مثلاً'' اصول''،'' موقع'' کے ساتھ عام طور پر'' سنہری'' لکھتے ہیں۔ لیکن اگر'' سنہرا/ سنہرے'' لکھا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ عام طور پر'' سنہرا/ سنہری'' کو اس لفظ کی جنس کے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں جس کی صفت بیان ہو رہی ہے، مثلاً'' سنہری کتاب''،'' سنہرا صفحہ'' وغیرہ۔'' امام'' لفظ کے کئی معنی ہیں، جن میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ شخص جو نماز پڑھاتا ہے اسے'' امام'' کہتے ہیں۔ لفظ'' پیش امام'' کے صرف ایک معنی ہی ہیں: وہ شخص جو نماز پڑھاتا ہے۔ ہم امام بخاری، امام غزالی، امام شاہ ولی اللہ کہتے ہیں، یہاں پر'' پیش امام'' نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اپنی مسجد میں نماز پڑھانے والے شخص کو یہ

کہیں کہ یہ ہماری مسجد میں امام ہیں، یا یہ کہیں کہ یہ ہماری مسجد میں پیش امام ہیں، دونوں ٹھیک ہیں۔

(سوالات: از محمد یعقوب فاروقی، گورکھپور)

سوال: میں محکمہ عدلیہ جموں و کشمیر میں ملازم ہوں چونکہ ہماری ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے اس لیے دیگر محکموں کی طرح یہاں بھی بیشتر کام اردو ہی میں ہوتا ہے۔ راقم کو اپنی چھ سالہ ملازمت کے دوران جن جج صاحبان اور بزرگ ملازمین کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ان سب حضرات کو مقدمات میں معمول کی کاروائی درج کرتے وقت کاروائی کے آخر میں ایک ایسے جملے کو تحریر کرتے ہوئے دیکھا ہے جس کی صحت میں راقم کو شک ہے۔ ذیل میں چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

مثال-1: 1.6.07 po حاضر۔ ملزم غیر حاضر۔ ملزم کو باجرائے وارنٹ گرفتاری طلب کیا جا کر مثل بتقرر 13.9.07 کو پیش ہووے تحریر الصدر

مثال-2: 1.6.07 po حاضر، ملزم غیر حاضر، ملزم کو باجرائے وارنٹ گرفتاری طلب کیا جا کر مثل بتقرر 13.9.07 پیش ہووے تحریر الصدر

مثال-3: 1.6.07 po حاضر ملزم غیر حاضر۔ ملزم کو باجرائے وارنٹ گرفتاری طلب کیا جا کر مثل بتقرر 13.9.07 تحریر الصدر

مثال-4: 1.6.07 po حاضر۔ ملزم غیر حاضر۔ ملزم کو باجرائے وارنٹ گرفتاری طلب کیا جا کر مثل 13.9.07 کو پیش ہووے تحریر الصدر

درج بالا مثالوں میں مثال (1) کے آخر میں ''مثل بتقرر 13.9.07 کو پیش ہووے'' مثال (2) کے آخر میں ''مثل بتقرر 13.9.07 پیش ہووے'' مثال (3) کے آخر میں ''مثل بتقرر 13.9.07'' اور مثال (4) کے آخر میں ''مثل 13.9.07 کو پیش ہووے'' درج ہے۔

آپ سے استدعا ہے کہ درج بالا مثالوں میں صحیح اور غلط کی وضاحت کے ساتھ نشاندہی کر کے ممنون فرمائیں۔

جواب: آپ نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عدالتی زبان کی ہیں۔ ہر علاقے میں عدالتیں اپنی اپنی سہولت کے اعتبار سے اصطلاحی الفاظ یا مروج الفاظ کی اپنی ہی شکلیں بنالیتی ہیں۔ آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ''مثل بتقرر'' کے معنی کیا ہیں، تو یہ عرض کرنا ہے کہ لفظ ''مثل'' کو لوگ ث سے لکھتے ہیں اور س سے بھی اور اسے ''مقدمے کے کاغذات'' یعنی ''فائل'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کی اصل کے بارے میں بہت بحث ہے لیکن اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ بہرحال آپ کی پیش کردہ مثالوں میں ''مثل'' کے معنی ''کاغذات مقدمہ'' یا ''فائل'' ہیں اور ''بتقرر'' کے معنی ہیں ''ضرور''، انگریزی میں Definitely یا Positively۔ اگر کہیں پر صرف تاریخ لکھ کر لفظ ''کو'' نہیں لکھا گیا ہے، یا تاریخ کے بعد صرف ''پیش ہووے'' لکھا گیا ہے، تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، معنی وہی رہتے ہیں کہ مقدمے کے کاغذات فلاں تاریخ کو بالیقین یا ضرور پیش کیے جائیں۔

سوال: صحت زبان کے لحاظ سے حسب ذیل میں سے درست تر کیا ہے؟

(1) ہمارا ادبی ادب ہماری اپنی زبان میں ہی محفوظ ہے؟

(2) ہمارا ادبی ادب ہماری اپنی ہی زبان میں محفوظ ہے۔

(1) صرف اردو ہی نہیں...

(2) صرف اردو نہیں...

جواب: جب کسی لفظ کے معنی پر زور دینا ہوتا ہے یا اس طرح استعمال کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اس کے معنی محدود ہو جائیں تو اس لفظ کے فوراً بعد لفظ ''ہی'' کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسے موقعے پر لفظ ''ہی'' کو ''حرف حصر'' کہا جاتا ہے، یعنی ایسا لفظ جو معنی کو گھیر دے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ عام اصول ہمیشہ یہی ہے کہ جس لفظ پر زور دینا یا اس کے معنی کو پوری طرح واضح کرنا مقصود ہوتا ہے، اس کے فوراً بعد لفظ ''ہی'' کو حرف حصر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو محاورے کے خلاف ٹھہرے گا اور حرف حصر غلط جگہ پر ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے معنی پوری طرح برآمد نہیں ہوں گے۔ اس بات کے ثبوت میں کہ ''ہی'' کو حرف حصر کے طور پر اس لفظ کے فوراً بعد استعمال کرتے ہیں جس کے معنی کو محصور کرنا مقصود ہے، مندرجہ ذیل مثالیں دیکھیے۔

مجھ ہی = مجھی	جب ہی = جبھی
ان ہی = انہی/انھی	سب ہی = سبھی
تم ہی = تمھیں	

وغیرہ۔ یعنی یہاں پر ''ہی'' کا حصر اس قدر مضبوط ہے کہ اس نے ایک نئے لفظ کو خلق کر دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر آپ کو اس بات پر زور دینا ہے کہ بات خود آپ سے کہی گئی تھی، یعنی کہنے والے نے ارادہ کر کے آپ سے کہا ہوگا تو آپ کہیں گے کہ ''اس نے مجھ ہی/مجھی سے کہا''۔ آپ یہ نہ کہیں گے کہ ''اس نے مجھ سے ہی کہا''۔ ہاں اگر کئی لوگوں کا بیان مقصود ہو کہ کئی لوگ تھے لیکن اس نے صرف مجھ کو تخاطب کے لیے منتخب کیا، تو کہہ سکتے ہیں کہ ''اس نے مجھ سے ہی

کہا"۔ یعنی اور لوگ بھی مخاطب کے لائق تھے لیکن اس نے صرف مجھے اس کا اہل سمجھا۔ یہ درست ہے کہ بعض بعض موقعوں پر بڑے شاعروں نے "ہی" کو حرف حصر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا ہے کہ اسے اس لفظ کے فوراً بعد لایا جائے جس کے معنی کو محصور کرنا ہے۔ ایسی مثالیں ان شعرا کے مختارات میں قرار دیں جائیں گی۔ انھیں عام قاعدے کے طور پر رائج نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اردو میں "نہیں" کا استعمال بہتر طور پر اس وقت ہوگا جب اسے فعل کے فوراً پہلے استعمال کیا جائے۔ لہٰذا آپ کی پیش کی ہوئی مثال میں "استعمال نہیں ہوتی" بہتر ہے، اور "نہیں استعمال ہوتی"، اس سے کم اچھا ہے۔ لیکن "نہ/نہیں" کے استعمال کے بارے میں کوئی مسلم قاعدہ نہیں بن سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے ممکن حد تک فعل کے فوراً پہلے استعمال کیا جائے، لیکن اگر ایسا کسی بنا پر نہ ہوسکے تو اسے فعل سے بہت دور نہ رکھا جائے۔

"مکلف" کے ساتھ "پر" یا "کا" دونوں درست ہیں۔ لیکن "پر" زیادہ رائج ہے۔

"ہنس کرکے/ہنس کر/ہنس کے"، تینوں درست ہیں۔ جس کو جس طرح مناسب معلوم ہو لکھے یا بولے۔ پہلے زمانے میں دہلی میں "کرکر" بولا اور لکھا جاتا تھا۔ مثلاً "یہ کام کرکر آؤ"۔ یا جیسے کہ میر کا مصرع ہے۔

شاید کبوتر ان کے کھایا کباب کرکر

اب اس طرح کا استعمال رائج نہیں

(سوالات: از اعجاز احمد، گیا)

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-एउर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066.

Ph.: 26109746, 26169416 Fax:26108159, E-mail: urducouncil@rediffmail.com

پونہ کتاب میلہ

تاریخ : 05 تا 09 دسمبر 2007

وقت : 10 بجے دن سے شام 8 بجے تک

مقام : گنیش کلا منچ، نہرو اسٹیڈیم، پونہ

قومی اردو کونسل کے اسٹال پر آپ کا خیر مقدم ہے، جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں

مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لسانیات، لغات، قواعد اور علم کتب خانہ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات، معاشیات، تجارت، سائنس و تکنولوجی، بچوں کا ادب، (CBT in Urdu) طب و معالجات

عزیز احمد

اردو کی ترویج و ترقی کے لیے عملی اقدام کی ضرورت

بات ہے صرف لکھنے پڑھنے کی:

زبان کی دو شکلیں ہوتی ہیں: بول چال کی زبان اور تحریری زبان۔ اصل زبان بول چال کی زبان ہے اور تحریری زبان اساساً بول چال کی زبان ہی کی نمائندگی کرتی ہے۔ کسی زبان کو پوری طرح جاننے کا مطلب ہے کہ آپ اس کی ان دونوں شکلوں کو جانتے اور انھیں استعمال کر سکتے ہیں۔ اردو چونکہ ہماری مادری زبان ہے اس لیے ہم سب لوگ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ اسے جانتے ہیں اور بلاتکلف بولتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے وہ بھی اردو جاننے والوں میں ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری بہت بڑی تعداد اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ اس میں غیر تعلیم یافتہ اور تعلیم یافتہ دونوں شامل ہیں اور اس وجہ سے ہم لوگ اردو کو اپنے بہت سے روزمرہ کے کاموں میں استعمال نہیں کر سکتے۔

یاد رکھیے ہمیں اردو سیکھنا نہیں ہے۔ اردو تو ہم جانتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اس کا لکھنا پڑھنا سیکھنے سے یہ صلاحیت بہت تھوڑے وقت میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ہم ایک ماہ تک ایک گھنٹہ روزانہ اردو کے حروف اور اعراب و علامات اور ان کا ملانا لکھنا پڑھنا سیکھیں تو کافی ہوگا اور اگر تین ماہ تک اس عمل کو جاری رکھا جائے تو اچھی خاصی مہارت حاصل ہو سکتی ہے۔

اردو کا رسم الخط دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک طویل تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے۔ ہم اسے صدیوں سے اسی شکل میں برتتے اور قبول کرتے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ ہمارا رسم الخط ہمارے تلفظ، ہماری شائستگی اور ہمارے لسانی، ادبی، علمی اور ثقافتی سرمائے کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس ضمن میں بعض دوسری زبانوں سے استفادے کا ذکر تاریخی دلچسپی کا موضوع تو ہو سکتا ہے لیکن بار بار یہ ذکر چھیڑنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ غلط فہمیوں کا سبب بنتا رہا ہے۔ اردو کے حروف سارے کے سارے اس کے اپنے ہیں، ناگزیر ہیں اور ایک طویل تاریخی عمل کے مرہونِ منت ہیں۔ اردو میں آنے والی اصوات جتنی بھی ہیں اردو کے حروف اور اعراب و علامات ان تمام اصوات کو بخوبی نباہ لیتے ہیں۔ اردو اس اعتبار سے ایک غیر معمولی ہندوستانی زبان ہے کہ اس میں مستعمل اصوات کی تعداد فرداً فرداً سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور تمام ہندوستانی زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اصوات کی اسی افراط کی وجہ سے اردو والے دنیا کی کسی بھی زبان کو نسبتاً جلد سیکھ لیتے ہیں اور اس زبان کا ان کا تلفظ اہلِ زبان جیسا ہو جاتا ہے۔

اس دور میں اردو بولنے والے معاشرے کے سامنے ایک بہت ہی اہم مسئلہ اپنی زبان، ثقافت اور تشخص کے تحفظ کا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم تھوڑی سی فعالیت کا مظاہرہ کر کے اپنے بچوں کی پرائمری تعلیم کے پانچ سال میں ان مقاصد کے حصول کی کوشش کریں۔ پرائمری تعلیم کے بنیادی مقاصد میں زبان اور کلچر کا تحفظ اور نسل در نسل ان کی منتقلی، زبان کا لکھنا پڑھنا اور اس کی نظم و نثر کا تعارف، حساب، ماحول کا ادراک اور مل جل کر رہنے کی تربیت شامل ہیں۔ پانچ سال بہت ہوتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنے پرائمری تعلیم کے پروگرام کے ساتھ سنجیدگی برتیں، اسے منظم، مربوط اور موثر بنائیں اور اس کی جدید کاری پر توجہ دیں۔ پرائمری تعلیم پر نظر رکھنا ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کی بجائے اس شعبے میں خود سرگرم ہوں اور حکومت کو اس ضمن میں اپنی آئینی فرض گزاری کے لیے بھی آمادہ کریں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ زبان اور کلچر کے تحفظ کی ذمے داری ہمارے اوپر ہے۔ اگر ہم اپنی زبان اور کلچر کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ فطری اور مؤثر پرائمری تعلیم و تدریس اور تربیت صرف مادری زبان کے توسط ہی سے ممکن ہے، ورنہ وہ ہوتا ہے جو ہو رہا ہے۔

اردو زبان و ثقافت کے تحفظ کی اہمیت کو سمجھنے کا ایک طریقہ شاید یہ بھی ہو سکتا ہے:

ہم جس زبان کو ایک عرصے سے ہندوستانی کہتے آئے ہیں وہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے تمام علاقوں کی بول چال کی زبان ہے اور ان علاقوں کے سب لوگ بلا امتیاز مذہب، نسل، رنگ اور ذات پات یہی زبان بولتے ہیں۔ مزید برآں برِصغیر میں اس بول چال کی زبان کے بہت سے جزیرے بھی ہیں۔ عملی طور پر اب یہ بول چال کی زبان الگ الگ زبانیں بولنے والے برِصغیر کے ایک سو پچاس کروڑ عوام کے درمیان رابطے کی زبان بن چکی ہے۔ اردو دراصل اسی ہندوستانی بول چال کی معیاری شکل ہے۔ اسی وجہ سے فلمی صنعت کے پہلے دن سے آج تک ہماری فلموں کی مقبول ترین زبان اردو ہی رہی ہے اور اردو فلمیں تمام برِصغیر میں اور برِصغیر کے باہر بھی جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے کئی ملکوں میں بڑے شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ کئی سو سال سے اردو ہماری مشترکہ تہذیب کا خوب صورت مظہر اور معتبر ترجمان ہے۔ یہ ملی جلی تہذیب برِصغیر کی مثالی تہذیب ہے۔ اسے ہم گنگا جمنی تہذیب بھی کہتے ہیں۔

یہ تہذیب اٹھارھویں صدی کے طوفانوں سے فنا نہیں ہوئی۔ 1857 کے سیاسی تصادم اور بیرونی غلبے سے ختم نہیں ہوئی اور 1947 کے خونیں سیلاب میں ڈوب کر بے نشان نہیں ہوئی۔ یہ تھی، ہے، اور رہے گی۔ وجہ ہمارا یہ تہذیبی رویہ ہے کہ ہمارے لیے کوئی غیر نہیں ہے۔ ہم فطری انداز میں آنے والے خارجی اثرات کو بہ رضا و رغبت جذب کر لیتے ہیں۔ دوسروں سے بلا تکلف سیکھتے ہیں لیکن خود کو برقرار رکھتے ہیں۔

مشرق وسطی، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ، کینڈا ہر جگہ اردو پہنچ رہی ہے۔ کتنی جگہیں ہیں جہاں اردو والے اپنی دنیا بنا کر رہ رہے ہیں۔ اردو کے اخبارات اور رسائل نکال رہے ہیں، اردو تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں، اردو کی ادبی انجمنیں بناتے ہیں، شعر و ادب کی محفلیں سجاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسرے ملکوں میں رہائش پذیر ہیں اور اردو شعری و نثری ادب کی تخلیق میں مصروف ہیں۔ ہندوستان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام سے ایک بڑی یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے جس میں تمام علوم و فنون کی تدریس اردو زبان کے توسط سے ہوتی ہے۔ حکومت ہند کے تحت ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 1996 سے سرگرم عمل ہے۔ اردو، فارسی اور عربی کے فاصلاتی کورس، کمپیوٹر تعلیم، خطاطی اور گرافک ڈیزائن، اردو پریس پروموشن، درسی اور غیر درسی کتابوں اور مجلوں کی اشاعت، اردو کا رشتہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑنا اور تعلیمی مشاورت وغیرہ کونسل کی فعالیت کی قابل قدر حصولیابیاں ہیں۔ اس کونسل سے بجا طور پر اور بھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان میں ہندوستان سے باہر بہت سے ملکوں کی دانش گاہوں میں اردو زبان و ادب کی تدریس و تحقیق کے شعبے موجود ہیں اور دنیا کے تمام بڑے اور اہم ریڈیو اسٹیشن چوبیس گھنٹے میں کئی بار اردو خبریں، مباحثے اور کلچرل پروگرام نشر کرتے ہیں۔ کلاسیکی، جدید ہندوستانی اور مغربی دھنوں کے ساتھ اردو غزلیں اور گیت پورے جنوبی ایشیا میں رات دن گائے جاتے ہیں جنھیں ساری دنیا سنتی ہے اور لطف اندوز ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اب اردو دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی چند زبانوں میں ہے۔

ہمارے آئین میں دفعہ 351 کے تحت اردو کے فروغ کے لیے جو ہدایت درج ہے اس کا منشا واضح طور پر یہ ہے کہ اس کا فروغ اس طرح ہو کہ یہ زبان ہندوستان کی مشترک تہذیب و تمدن کے تمام عناصر کے اظہار کے میڈیم کے طور پر کام آئے۔ اردو ہماری مشترک تہذیب کی ترجمان ہے۔ اس کا فروغ اسی تہذیب کے آغوش میں ہوا ہے۔ اس تہذیب کی اساس ہندو مسلم بھائی چارے پر ہے۔ جس طرح ہندو مسلم اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ ایسی تمام تحریکیں بند کی جائیں جو ان دونوں فرقوں میں نفاق پیدا کرتی ہیں، اسی طرح اردو کو جو سارے ملک میں رابطے کی زبان ہے اس کی لفظیات، تلفظ، رسم الخط اور ادب کو ہر حالت میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اردو اور اس کی شاعری مختلف مذہبوں، زبانوں، نسلوں اور مقامی تمدنوں سے جڑے ہوئے کروڑوں لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ اس اعتبار سے ملک کے اندر اور برصغیر کے عوام کے مابین رابطے کے لیے اردو کا کوئی مناسب متبادل نہیں ہے۔ تاریخ نے اس عظیم لسانی اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کی جو ذمے داری ہمارے اوپر ڈال دی ہے ہم اسے آخر کیوں نہ پورا کریں؟ یہ دراصل ایک چیلنج ہے اور ہماری عافیت، خوشی اور روحانی آسودگی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے بخوشی قبول کر لیں، اس سچائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ زبان و ثقافت جس کا ہم تحفظ کر رہے ہیں قومی ورثہ ہے اور اس کا خسارہ سب کا خسارہ ہوگا۔ یہ کام مشکل نہیں ہے۔ اگر ہم سب مل کر باتوں کے بجائے عمل، اپنے وسائل پر اعتماد اور اپنی مدد آپ کے اصولوں کو مشعل راہ بنائیں اور پورے خلوص کے ساتھ اس کام کو کرنا شروع کریں تو یہ ہمارے لیے بالکل آسان ہو جائے گا اور وہ بھی جو ابھی تک ہمارے ساتھ نہیں ہیں ہمارے ساتھ آ جائیں گے۔

یہ پروگرام اپنے اندر ایک تحریک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم جہاں بھی رہتے ہیں اگر وہاں یکساں فکر رکھنے والے چند احباب مل بیٹھیں اور ایک اردو مرکز، اردو کلب، اردو سینٹر، اردو گھر کا تعین کر کے ایک مشاورتی / جائزہ کمیٹی بنا لیں تو کام شروع ہو جائے گا۔ اس پروگرام کو اردو مرکز کی ابتدائی میٹنگ میں ایجنڈے کی حیثیت دی جا سکتی ہے اور اس پر عمل درآمد کی راہیں نکالی جا سکتی ہیں۔ اس پروگرام کو بتدریج آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ پروگرام عملی ہے۔ بیکار بحث یا اردو کی تاریخ و جغرافیہ بیان کرنے کا منصوبہ نہیں ہے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً اس پروگرام کے حوالے سے مرحلہ وار پیش رفت کا جائزہ لیتے رہنا ضروری ہوگا۔

ایک قومی ورثے کے تحفظ اور فروغ کی کوششوں میں آپ اپنے وجدان کے مطابق معاون بن سکتے ہیں۔ اگر کسی اخبار یا رسالے سے منسلک ہیں تو اپنے موقر جریدے میں اس عملی پروگرام کو تھوڑی سی جگہ عنایت فرما کر اس پروگرام کی مزید اشاعت اور ترویج میں مدد کر سکتے ہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی/ کالج یا اسکول میں ہیں تو اس پروگرام کو تحریک بنا سکتے ہیں۔ اگر صحافی، ادیب یا مضمون نگار ہیں تو اپنی تحریروں میں اس پروگرام کے عملی پہلو اور اپنی مدد آپ کے اصول کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ اگر کسی دینی مدرسے میں ہیں تو اپنے نصاب کی تفہیم کو آسان اور موثر بنانے کے لیے اردو کی ناگزیریت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پورے کے پورے پروگرام کو اپنے مدرسے میں عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اگر

آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرتے ہیں، خطبہ دیتے ہیں، یا وعظ کرتے ہیں تو بڑی آسانی سے اس پروگرام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں اور ان میں اپنی مادری زبان سے محبت اور وفاداری کے جذبات کو جگا سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں کچھ بھی کرتے ہوں کسی بھی حال میں ہوں اپنے گرد و پیش میں مادری زبان کے تحفظ کا جذبہ پیدا کرسکتے ہیں۔

یہ پروگرام ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو ہر کام کو آل انڈیا لیول سے شروع کرتے ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اپنی عملی حیثیت کے پیش نظر یہ بالکل مقامی ہے۔ جب تک مقامی ذہن کام نہیں کرے گا خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوگی۔ ہر یونٹ کام کرے تو مرکز کے بھی کوئی معنی ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا ہر جگہ اگر صرف چند لوگ ہی فعال ہو جائیں تب بھی مجموعی طور پر بڑا کام ہوسکتا ہے۔ کام شروع تو کیجیے۔ اس کام کو شروع کرنے کے لیے کسی بڑی نقل و حرکت یا تیاری کی ضرورت نہیں ہے اور جزوی عمل درآمد میں تو سرے سے کوئی دقت ہی نہیں ہے۔

خدانخواستہ اگر ضعفِ عمر، خرابیٔ صحت یا غیر معمولی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے آپ کچھ اور کرسکنے سے معذور ہوں تو کم از کم اتنا کرنے کی تکلیف لطفاً گوارا فرمالیجیے کہ اس مضمون کی دس دس فوٹو کاپیاں بنوا کر ایسے افراد تک پہنچا دیں جن کے بارے میں آپ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس ضمن میں کچھ کرسکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
57, Tehsildar House, New Abadi,
Hapore-245101

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے، جس میں استخلاص وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت -/300 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں، جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

انیس چشتی

اردو تحریر کی تدریس

[جدید تحقیقات کی روشنی میں]

کمپیوٹر کی ایجاد نے صرف طلبہ کو ہی نہیں بلکہ ایک عالم کو بھی تحریری عمل سے دور کر دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تعلیمی عمل میں ''تحریر'' سے گریز ممکن ہے۔ کسی بھی زبان کی تدریس میں اساتذہ کے لیے سب سے مشکل مرحلہ طلبہ کو تحریر پر آمادہ کرنا ہے۔ پورے تعلیمی عمل میں تین موقعوں پر تحریر کی ضروریات پیش آتی ہے:

1۔ کسی سابقہ تحریر یا تقریر کو نقل کرنے کے لیے۔ مثلاً کوئی اقتباس یا قرآن و حدیث کی کتابت، 2۔ ترجمے کے وقت، 3۔ طبع زاد تحریر یا اپنے ذاتی خیالات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے (نظم یا نثر)

اب تک کی تحقیقات اور تجربوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کی تحریر کی بنیاد دائرہ [o] ، مثلث ، [ح] اور مربع [χ] پر مشتمل ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اردو زبان کی تحریر میں دائروں کا استعمال 60 فی صد ، مثلث اور مربعوں کا استعمال بالترتیب 25 اور 15 فیصد کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی طرح مصوتوں [او. ی. ے.] کے علاوہ 'ن' کا استعمال سب سے زیادہ ہے۔ الف اور واؤ الفاظ کے بیچ میں آنے کے باوجود اپنی شکل نہیں بدلتے ہیں جب وہ کسی سابقہ حرف سے جوڑے جاتے ہیں مثلاً والد میں 'ذ' کی شکل رجیسی ہوگی۔ 'ز' اکبر میں طویل ہو گئی ، وغیرہ وغیرہ۔ بالکل ابتدائی درجوں میں اگر استاد رڈی کاغذ پر اسکیچ پین سے صرف دائرے، مثلث ، مربعے یا آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کی خوب مشق کروالے تو اس سے طلبہ کے عصبی عضلائی نظام (Neuro Muscular System) کی تربیت بڑی حد تک ہو جائے گی۔ اس عمل کی مدد سے طلبہ کو بامعنی تحریر کی جانب آمادہ کیا جاسکے گا۔ تحریر میں ذہانت کے علاوہ عصبی عضلاتی ہم آہنگی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

اردو میں لکھے جانے والے ہر لفظ کا اگر آپ تجزیہ کریں تو پتہ چلے گا کہ اس کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے بغیر ہاتھ اٹھائے لکھا گیا ہے۔ پھر چاہے وہ اکبر جیسا آسان لفظ ہو یا قسطنطنیہ، نستعلیق اور مستنعفین وغیرہ جیسے مرکب الفاظ ہوں۔ ان الفاظ میں نقطوں اور بعض مراکز کے جوڑ کے علاوہ بڑی حد تک پوری تحریر میں کہیں ہاتھ اٹھایا نہیں گیا ہے۔ حروف کا یہ تواتر Ligature [حرفی بندھن] کہلاتا ہے۔ تحریر کی تدریس کے دوران بچے کی بیاض پر تھوڑی سی انفرادی توجہ اور تختۂ سیاہ پر ایسے الفاظ کو بار بار لکھنے سے تحریر کے اس ہمالیہ کو بہ آسانی سر کیا جاسکتا ہے۔

بعض اساتذہ کا یہ تصور ہے کہ (قط لگی ہوئی) نب سے لکھنے سے خط سدھرتا ہے، یہ پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ اب تختی لکھنے کا رواج بھی نہیں رہا۔ خوش خطی کے بعض بنیادی قواعد ہیں۔ تختۂ سیاہ پر اگر ان بنیادی قواعد کو ابتدا میں ہی بتا دیا جائے تو اگلی تعلیمی زندگی میں طالب علم کے بدخط رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوگا لیکن اس کا دارومدار کثرتِ مشق پر ہے۔ فارسی مثل مشہور ہے: 'می نویس و می نویس وی نویس'۔

کاغذ یا تختۂ سیاہ پر عمدہ تحریر کا مظاہرہ بھی طلبہ میں تحریر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ کسی مقامی خطاط یا کاتب کو درجے میں بلاکر بھی یہ مظاہرہ کروایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اردو کی کسی کتاب میں سے روزانہ کم از کم 5 سطریں قط لگے نیب سے لکھ کر لانے کے لیے کہیں۔ گھروں میں نبیں کاٹنے سے بہتر ہے کہ بازار میں دستیاب خوش نویسی (Calligraphy) کی تیار نبوں کا استعمال کیا جائے۔ البتہ کسی مقابلہ جاتی یا پبلک امتحان میں بچوں کو قط زدہ قلم سے لکھنے کا مشورہ نہ دیں۔ اس سے تحریر کی رفتار پر اثر پڑتا ہے جو طالب علم کی تعلیمی ترقی کے لیے نقصان دہ ہے۔

اردو رسم الخط کے نستعلیق Font کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں حروف کے جوڑ اور پیوندوں کے درمیان نقطوں اور اعراب کے لیے ناکافی جگہ ہے۔ اسی لیے نستعلیق رسم الخط میں ہمارے ہاں قرآن کریم کی اشاعت کا رواج نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیشہ سے نسخ (عربی) Font کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ اردو تحریر کی اسی خوبی یا خامی کا نتیجہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ حظ (ح ظ) کو خط (خ ط) ، بنی (ب ن ی) کو نبی (ن ب ی)، رجحان (ر ج ح ان) کو رحجان (ر ح ج ان) اور سجری (س ج ز ی) کو سنجری (س ن ج ر ی) پڑھ لیتے ہیں۔ اردو میں غلط املا نویسی اور قرأت کی ایسی لاتعداد مثالیں ہیں۔ اس خامی پر قابو پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ تمام نقطوں کے لیے تحریر میں جوڑ لگائے گئے ہیں یا نہیں، اس کا بغور جائزہ لیا جائے۔ مثلاً بیڑی (ب ی ڑ ی) اور بیٹری (ب ی ٹ ر ی) لکھنا ہو تو دیکھا جائے کہ طالب علم نے تمام Characters اور آوازوں کے لیے مناسب جوڑ لگائے ہیں یا نہیں؟ اردو تحریر سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس کے محاسن کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مثلاً حسن، گولائی، کشش، نوک پلک اور دائیں سے بائیں لکھے جانے کی وجہ سے یہ خط لوگوں میں جمالیاتی حظ (Aesthetic Sense) پیدا کر کے ان کی بینائی کو نور عطا کرتا

ہے۔ نیز یہ امراضِ چشم سے حفاظت کے لیے بھی مشہور ہے۔

تعلیم و تدریس کے ابتدائی دنوں میں بال پین کا استعمال کسی بھی تحریر کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ کیونکہ بال پین اپنی گولائی کی وجہ سے کاغذ پر پھسلتا ہے، چنانچہ نو آموز طالب علم کا عصبی عضلاتی نظام پر قابو نہیں رہنے پاتا۔ البتہ کالج کی اونچی کلاسوں میں بال پین کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اچھی تحریر یا خوب لکھنے کی عادت طالب علم کو خوب پڑھنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ تحریر کا ایک اہم جز جس طرح خوش نویسی یا خوش خطی ہے، اسی طرح رموز و اوقاف بھی کسی تحریر کا جزوِ اعظم ہیں۔ داوین، وقفہ، داوِ معکوس (Comma) اور دیگر علامات کسی بھی زبان کی ترسیل کا خاص ذریعہ ہیں۔

قرآن کریم میں ان علامات کا استعمال پچھلے تقریباً چودہ سو سال سے جاری ہے۔ مروجہ عالمی زبانوں نے بھی یہ فن مذہبی کتابوں سے ہی سیکھا ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اردو اور فارسی کے قدیم مصنفین یہ فن فراموش کر چکے تھے۔ اردو کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان رموز و اوقاف کا استعمال اور التزام آج رائج ہے۔ رموز و اوقاف کی جتنی شکلیں اور قسمیں قرآن کریم میں ملتی ہیں اتنی دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔ ان علامات کا التزام، لہجے اور تمام صوتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ۃ، م، ط، ج، ز، ص، صلے، ق، صل، قف، س، لا، ک اور ہ وغیرہ وغیرہ رموز و اوقاف (Punctuation) کی وہ علامتیں ہیں جو کسی بھی ترقی یافتہ، زبان کی تحریری اور صوتی ترسیل کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ طلبہ کو رموز و اوقاف کے استعمال کا پابند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ سے معیاری عبارتیں نقل کروائی جائیں۔ اشعار فہمی اور نثر و نظم خوانی کے دوران اس کی مثالیں دی جائیں کہ یہ کس طرح مفہوم و معنی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً:

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

[مضمون نگار تسلیم شدہ خطاط اور فانٹو گرافر بھی ہیں]

□□□

پتہ:
116, Sterling House, 1984,
Convent Street, Pune - 411001

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ "اسلوبیات" کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

نشاطِ روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام "نشاطِ روح" (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے "تبصرہ" کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

ایم. آئی. ساجد

ودربھ کے دیہی علاقوں میں اردو پرائمری تعلیم

آج کے بے حد ترقی یافتہ دور میں تعلیم کو جو مقام حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے چاہے بنیادی تعلیم ہو، ثانوی ہو یا کالج اور یونیورسٹی سطح پر یا پھر جدید ٹیکنالوجیکل، میڈیکل یا کمپیوٹر کی۔ ہر میدان میں ہر شعبۂ حیات میں اس کی افادیت واہمیت مسلم ہے اور یہ دور جدید کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر ترقی وخوشحالی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

مہاراشٹر میں علاقہ ودربھ ماضی میں تعلیمی اعتبار سے کافی پچھڑا ہوا تھا۔ مختلف حکمرانوں کے تحت رہنے کی بنا پر یہاں پرائمری تعلیم کا وہ رجحان عام نہیں ہو پایا تھا جس کی بجا طور پر ضرورت تھی۔ آزادی سے قبل پرائمری تعلیم کے نام پر مکتبوں، خانقاہوں اور خانگی مدرسوں میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ کچھ مدرسوں میں فارسی کی ابتدائی تعلیم کا بھی بندوبست تھا۔ بہت کم مقامات پر اردو ذریعۂ تعلیم کے مدرسے قائم تھے جو ناکافی تھے۔ یہ تو سرسید احمد تحریک کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے جس نے دیگر اصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ دے کر قوم کے خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کیا اور انگریزی کے ساتھ ساتھ مادری زبان میں بھی تعلیم جاری رکھنے کے لیے زور دیا اور پرائمری وثانوی مدارس قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ یہ سرسید تحریک ہی کی دین ہے کہ ودربھ میں جگہ جگہ اردو پرائمری مدارس کھولے گئے۔ اس تحریک پر لبیک کہتے ہوئے برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کانفرنس نے خصوصاً برار میں اردو ذریعۂ تعلیم کی کامیاب تحریک چلائی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس دیہات میں بھی اردو خواں طبقے کی معتدبہ آبادی ہے وہاں ایک اردو پرائمری اسکول ضرور ہے۔ گویا دیہات دیہات میں اردو پرائمری اسکولوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے اور یہ صرف ودربھ ہی میں نہیں بلکہ پورے مہاراشٹر میں یہی صورت حال ہے۔

مہاراشٹر میں ودربھ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اردو پرائمری اسکولوں کی تعداد دیگر علاقوں کے مقابلے زیادہ ہے اور آئے دن ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ صرف بلڈانہ ضلع میں اس وقت اردو پرائمری اسکولوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ایک سو پچاس 150 کے قریب ہے۔ ودربھ میں اسّی 80 فیصد کے قریب اردو پرائمری مدارس دیہاتوں میں قائم ہیں۔ کچھ ایسے بھی چھوٹے دیہات ہیں جہاں طلبہ کی تعداد کافی کم ہے لیکن پرائمری تعلیم کا بندوبست رکھا گیا ہے۔

اب تو حکومت کی جانب سے بھی جگہ جگہ اردو پرائمری مدارس قائم ہو چکے ہیں ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ طلبہ کو سہولتیں مل رہی ہیں اور تعلیم کا سلسلہ رکا نہیں ہے لیکن دورِ جدید کے تعلیمی مقاصد اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے معتدبہ تعداد کے باوجود بھی ہمارے پرائمری مدارس تعلیم کا وہ معیار پیش نہیں کر پا رہے ہیں جس کی آج اشد ضرورت ہے۔ اس بات سے سب ہی متفق ہیں کہ کسی بھی زبان کے ذریعۂ تعلیم کو بامقصد بنانے کے لیے بنیادی تعلیم کا معیار نہ صرف مؤثر بلکہ اعلیٰ بھی ہو۔

شہروں کی بہ نسبت دیہی علاقوں کے اردو پرائمری مدارس تعلیم کا معیار پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ ہر ناکامی کے پیچھے چند وجوہات اسباب اور مسائل ہوتے ہیں جو حل طلب بھی ہوتے ہیں۔ دیہی پرائمری مدارس بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دیہی پرائمری تعلیم کو درپیش ہیں اور جنھیں بہرحال حل کیا جانا ضروری ہے۔

(الف) تعلیم اور مدرسہ: تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے شہری اور دیہی۔ شہروں میں پرائمری تعلیم کے زیادہ تر مدرسے نگر پریشد کارپوریشن اور اکثر خانگی اداروں کے تحت چلتے ہیں جبکہ دیہاتوں میں پرائمری تعلیم کا انتظام ضلع پریشد کرتی ہے اور تمام انتظامات کی ذمے داری بھی اسی کی ہوتی ہے۔

(ب) مدرسہ کی عمارت: آج تعلیم کا تصور مدرسے کی عمارت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں تعلیمی نقطۂ نظر سے ہر چیز کا ہونا ضروری ہے جس میں ہر درجے کے لیے اچھا کمرہ تختۂ سیاہ گھریا۔ بیٹھنے کے لیے مناسب دریاں (بنچوں یا ڈیسکوں کی صورت میں) چارٹ نقشہ جات، تدریسی کتاب، پانی، میدان، ضرورت کے مطابق لیباریٹری کے علاوہ حالات کے تحت لگنے والی دیگر اشیا یہ چیزیں شہروں کے پرائمری مدارس میں تو نظر آجاتی ہیں لیکن دیہی اسکولوں میں عموماً ان کا فقدان ہوتا ہے جس سے تدریسی عمل میں خلل پڑتا ہے۔ اکثر دیہی علاقوں میں تدریسی اشیا تو دور کی بات رہی مدرسے کی عمارت کے نام پر کہیں

کہیں کچی مٹی کی دیوار ہی سے کام چلایا جاتا ہے۔

ان میں نہ بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے نہ مناسب تدریسی اشیا نہ ہی دیگر ضروری سہولیات۔ چند ایک مقامات پر ہی مدرسے کی عمارت اچھی حالت میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں تعلیمی معیار کا تصور کہاں تک کیا جا سکتا ہے؟ دیہی پرائمری مدارس کا یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو برسوں سے حل طلب ہے۔

مدرسہ اور دیہات کا ماحول: حکومت کا منشا یہی ہے اور منشور بھی کہ تعلیم کو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا جائے۔ کوئی دیہات یا قصبہ محروم نہ رہے اور نہ ہی کوئی ناخواندہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دیہاتوں میں تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور مدرسوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے لیکن دیہاتوں اور قصبات میں بیداری کی وہ لہر نظر نہیں آتی جو بنیادی تعلیم کو معیار عطا کر سکے۔

دیہاتوں کا ماحول آج بھی بڑی حد تک ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ اکثریت کاشتکاروں اور مزدوروں کی ہے جو اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ صرف نہیں کر پاتی صبح ہوتے ہی کھیت یا مزدوری پر نکل پڑتے ہیں تو پھر شام ڈھلے ہی گھر لوٹتے ہیں۔ انھیں اتنا وقت نہیں ملتا کہ اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دے سکیں۔ والدین کی عدم دلچسپی کی بنا پر بچے یا تو سرے سے مدرسہ ہی نہیں جاتے یا جاتے بھی ہیں تو مستقل طور پر نہیں اکثر غیر حاضر رہتے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ اکثر والدین یا سرپرست ضرورت کے اوقات میں بچوں کو اپنے ہمراہ کھیتوں پر یا مزدوری کے لیے لے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دیہاتوں میں مدرسین کو اول تو وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جس کا ایک معلم بجا طور پر حقدار ہوتا ہے اور اگر ہو بھی تو مدرس کی یاد دہانی کے باوجود بھی سرپرست بچوں کو مدرسہ نہیں بھیجتے۔ اکثر والدین کو یہ علم تک نہیں ہوتا کہ ان کا بچہ کس جماعت میں پڑھ رہا ہے اور پڑھ رہا ہے تو کیا پڑھ رہا ہے؟ اس کی ترقی کی رفتار کیا ہے؟ اس کے پاس نصابی کتب کے علاوہ دیگر لازمی اشیا ہیں بھی یا نہیں؟ وہ یا تو بچوں کو وقت گزاری کے لیے مدرسہ جانے کی اجازت دے دیتے ہیں یا خود سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے۔ بہت کم والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دے پاتے ہیں۔

مدرسہ اور مدرس ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ایک کا تصور دوسرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے: Teacher is a builder of the nation اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔

خصوصاً پرائمری اسکول کے مدرسین تو اپنی ذمے داریوں کو نبھانے میں کامیاب ہو بھی جاتے ہیں لیکن دیہی علاقوں کے مدرسین کو کئی دشواریوں، پریشانیوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ دیہات کا ماحول ہوتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو پوری طرح Adjust نہیں کر پاتے۔ اس کے علاوہ دیہی علاقوں کے مدرسوں میں تعلیمی وسائل کی کمی انھیں بے چین رکھتی ہے۔ وقت پر درسی کتب نہیں ملتیں۔ اکثریت غریب و نادار طلبہ کی ہوتی ہے۔ کتابوں، بیاضوں اور دیگر ضروری اشیا سے اکثر محروم رہتے ہیں۔ تدریسی اشیا کی فراہمی میں ضلع پریشد پنچایت سمیتیاں اور گرام پنچایتیں کافی تاخیر کر دیتی ہیں۔ طلبہ کی مسلسل غیر حاضری بھی درس و تدریس میں مشکلات کھڑا کرتی ہیں۔ جو طلبہ آج مدرسہ آتے ہیں وہ کل غیر حاضر رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اسی لیے ان کا وہ تعلیمی ذہن نہیں بنتا جو معیار کا گراف بڑھانے میں معاون ثابت ہو۔ والدین کی عدم دلچسپی مزید تشویش کا باعث بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی تعلقات اور محکمہ جاتی بنیادوں پر آئے دن ہونے والے مدرسین کے تبادلے بھی ان مسائل میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اکثر اساتذہ اپنی پسند کے مقام پر جانے کو ترجیح دیتے ہیں اور جب ایسا ممکن نہیں ہو پاتا تو ان کی بد دلی کے اثرات تعلیم پر پڑتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ایک ہی مدرس کو دو تین کلاسیں پڑھانی پڑتی ہیں۔ ایسے مدرسوں کو ''ایک مدرّسی مدرسہ'' کہا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں تعلیم کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے جبکہ ایک مدرس کو ایک وقت میں ایک ہی درجہ کی تدریس ملنی چاہیے۔ اس صورت حال سے طلبہ کے ساتھ ساتھ مدرس بھی ذہنی و جسمانی طور پر پریشان ہو جاتا ہے اور وہ معیار حاصل نہیں ہوتا جو مقصود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر مضمون کا نصابی مواد بھی اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ باوجود مدرس کی پر خلوص کوشش کے وہ اسے وقت پر پورا کرنے میں اکثر ناکام رہتا ہے۔

اکثر پرائمری تعلیم کے معیار پر اثر انداز ہونے والے وہ محکمہ جاتی کام بھی ہوتے ہیں جو ان مدرسین کے فرائض میں شامل کر دیے گئے ہیں مثلاً مردم شماری، فیملی پلاننگ، مختلف قسم کے سروے، گاہے گاہے نکلنے والے جلسے جلوس، ضلع پریشد اور پنچایت سمیتیوں کے انتخاب کی فہرستیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے کام اکثر اوقات دوسرے دیہاتوں یا قصبات میں بھی انجام دینے پڑتے ہیں جس سے تعلیمی معیار اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مدرسین کی جانب سے لی جانے والی طویل چھٹیاں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں عموماً مدرسین کی واقفیت دیہات میں رہنے والوں سے پوری طرح نہیں ہو پاتی یا تعلقات کی نوعیت وہ صورت اختیار نہیں کرتی جہاں والدین یا سرپرست مدرس کی بات کو اہمیت دینے کے لیے اس پر عمل کریں اور تعلیمی معیار کو اونچا کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مدرسین کو دیہاتوں میں اچھے یا

مناسب مکانات نہیں مل پاتے کہ وہ مستقل طور پر وہاں رہ سکیں۔ اس طرف سے مایوس ہو کر یا نئے زمانے کے تقاضوں کے تحت وہ دیہاتوں سے قریب ترین شہروں یا بڑے گاؤں میں اپنا زیادہ وقت گزارتے ہیں جس کا اثر تعلیم پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ آج کے اس نئے دور میں عام طور پر یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ اساتذہ جن کو حقیقت میں بچوں کا سیرت ساز اور قوم کا معمار Founder of Nation ہونا چاہیے ان صفات کا ان میں فقدان ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں میں مناسب نظم وضبط، وقت کی پابندی، اعلیٰ اقدار اور خدمت خلق جیسے عناصر ان کی شخصیت و سیرت میں دخل نہیں ہو پاتے۔ بچے اصل میں بڑے کامیاب نقال ہوتے ہیں جو اپنے اساتذہ میں دیکھتے ہیں وہ اپنی زندگی میں بھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں استاد کی ذمے داری بہت اہم ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی غلط قدم یا فعل بچوں کی سیرت سازی میں نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ استاد کو جب تک مقصد سے لگاؤ نہ ہو تعلیم کے صحیح مقاصد کا حصول ناممکن ہے اور اس دور میں بدنصیبی سے اساتذہ میں ان صفات کی کمی ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ:

گر ہمیں مکتب است ایں ملّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

ان تمام باتوں کی روشنی میں صورتِ حال مزید دیگرگوں ہو جاتی ہے اور تعلیم کا معیار بجائے اور اونچا اٹھنے کے ایک جگہ ٹھہر سا جاتا ہے۔ جبکہ دیہی علاقوں کے مدرسین کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے طور پر والدین اور سرپرستوں سے تعلقات قائم کریں۔ تعلیمی ضروریات کے لیے بار بار محکمہ سے رجوع کریں، غیر حاضر طلبہ کو مدرسہ آنے کے لیے تیار کریں۔ اس لیے کہ اب حکومت کی جانب سے پرائمری کے بچوں کو ایک وقت کا کھانا (چاول کی صورت میں) بھی مہیا کرایا جاتا ہے جو Drop out کم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اس طرح تعلیمی معیار کو اونچا اٹھانے کی کامیاب کوششیں کی جاسکتی ہیں۔

صدر مدرس: دیہی پرائمری مدرسوں میں صدر مدرس ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے صدر مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابل اور تجربہ کار ہو۔ سب کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ ہو۔ اپنے مدرسے کی بہتری اور ترقی کا دل سے خواہاں ہو۔ اسے انتظامیہ کا اعتماد بھی حاصل ہو۔ وہ اپنے مدرسے کے طلبہ کے سرپرستوں میں ذمے داری کا احساس بھی پیدا کرے۔ مدرسے میں مختلف قسم کے پروگرام کے ذریعے انھیں تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کرتا رہے۔ طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہو، وہ بہتر اور مثبت منصوبہ بندی پر کاربند رہے جس کی بنیاد انصاف، مساوات، خلوص اور ہمدردی پر ہو۔ صدر مدرس کا وسیع النظر اور جدید تدریسی رجحانات سے واقف ہونا نیز اس میں تعلیمی سطح پر بھرپور صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے تب ہی جاکر تعلیمی معیار اونچا اٹھ سکتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ بات مشاہدے میں آتی ہے لیکن اکثر مقامات پر منفی اثرات نظر آتے ہیں اس طرف بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

انسپکٹر آف اسکولس A.D.I'S: دیہی پرائمری مدرسوں کی تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے ہر ضلع میں انسپکٹر آف اسکولس (A.D.I's) ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر دیہی مدرسوں کا تعلیمی سروے کرتے ہیں۔ انھیں محکمہ کی جانب سے کافی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مدرسہ میں نصاب کے مطابق کام ہو رہا ہے یا نہیں طلبہ کی تعداد ان کے تعلیمی معیار کا جائزہ، سوالات و جوابات، مدرسین کی تعلیمی کارکردگی، درجوں کی سجاوٹ اور صفائی پانی اور کھیل کود کا انتظام، صدر مدرس کے فرائض منصبی کا جائزہ، تدریسی و دیگر مسائل کا خلاصہ اور ان پر عمل درآمد وغیرہ۔ چونکہ پہلے مدرسوں کی تعداد کم تھی اس لیے ایک انسپکٹر سے کام چل جایا کرتا تھا لیکن اب اسکولوں کی تعداد بڑھ چکی ہے لہٰذا حکومت نے انسپکٹر آف اسکولس کی مسلسل ذمے داریوں کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ضلع کے تعلقہ مقامات پر کیندر پرکھ केंद्र प्रमुख کو تعینات کر دیا ہے جو انسپکٹر آف اسکول کے ماتحت اور نگرانی میں وہی کام کرتے ہیں جو انسپکٹر آف اسکولس کیا کرتے تھے۔ اس طرح ذمے داریوں کی اس تقسیم سے اچھے اثرات بھی پڑے ہیں۔ ان کیندر پرکھ اور انسپکٹر آف اسکول کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ پوری دیانت داری سے دیہی علاقوں کے پرائمری مدارس کی نگہداشت کریں، ان کی مشکلات و مسائل کو حل کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ طلبہ اور مدرسہ کو بہتر سہولیات مہیا کرائیں اور تعلیمی معیار کو ہر ممکن طریقے سے اونچا اٹھانے میں صدر مدرس و مدرسین کی بھرپور مدد کریں لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے، کاغذی خانہ پوری کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اکثر معاملات کو صرف نظر کر دیا جاتا ہے یا کسی قسم کی کارروائی کی بھی جاتی ہے تو اس کی عمل آوری میں اتنی تاخیر ہوتی ہے کہ مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں قائم رہتا ہے اور وہ مقصد حاصل نہیں ہو پاتا جس کے لیے ان کی تعیناتی ہوتی تھی۔ اس طرف بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دیہی مدارس اور انتظامیہ: دیہی علاقوں کے پرائمری مدارس ضلع، پریشدوں کے ماتحت چلتے ہیں ان کی مدد کیلئے پنچایت سمتیاں اور گرام پنچائتیں ہوتی ہیں۔ تمام احکامات یہیں سے جاری ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں کے مدرسین اپنی اور مدرسہ کی ضروریات کے پیش نظر قریبی پنچایت سمتیوں یا ضلع پریشد آفس سے رجوع کرتے ہیں چاہے وہ مسائل مدرسہ کی عمارت کے ہوں، تبادلے کے ہوں، طلبہ کے داخل خارج کے ہوں، تعلیمی وسائل کے ہوں یا

امتحانات کے نتائج وغیرہ کے ہوں ضلع پریشد ان کا معقول انتظام اور بندوبست کرتی ہے اور ضروری احکامات جاری کرتی ہے لیکن اکثر ان احکامات کو جاری کرنے اور مسائل کو حل کرنے میں جو تاخیر ہوتی ہے وہ بعض اوقات نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ ضروری کاموں کیلئے صدر مدرس اور اساتذہ کو بار بار آفیس کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ متعلقہ افسران سے ملنا ہوتا ہے اور کسی ایک ضروری کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کافی پریشانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی میں جیب پر بھی بار پڑتا ہے اور تعلیمی اوقات کا بھی حرج ہوتا ہے۔ مدرسین کی پریشانیاں اور غیر حاضری تعلیمی معیار کو متاثر کرتی ہے۔ ان مسائل کے حل کیلئے انتظامیہ خاطر خواہ توجہ دے تو تعلیم پر اس کے مثبت اثرات پڑ سکتے ہیں۔

دیہی مدرسے اور نصاب تعلیم: نصاب درس و تدریس کی بنیاد اور اہم ترین ضرورت ہے۔ آج جدید تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم کا نصاب تیار کیا جاتا ہے۔ اسلیے بھی کہ یہ گلوبلائزیشن اور الکٹرنک میڈیا کا دور ہے لہذا نصابی تعلیم کے علاوہ طلبہ کو نت نئی معلومات سے روشناس کرانا بھی ضروری ہو جاتا ہے لیکن دیہی علاقے زیادہ تر اسی سے محروم ہی رہتے ہیں کہ تعلیمی نصاب نہ صرف شہری بلکہ دیہی طلبہ کیلئے بھی ان کی ذہنی سطح (I.Q.) سے کہیں زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ دیہی پرائمری مدرسوں میں طلبہ کی مسلسل غیر حاضری بھی نصاب پورا نہیں ہونے دیتی یا وقت پر مکمل نہیں ہو پاتا کم طلبہ استفادہ کر پاتے ہیں اور اکثریت محروم رہ جاتی ہے۔ مدرس کو تمام مضامین کی طرف توجہ دینی ہوتی ہے جسمیں مادری زبان کے علاوہ علاقائی زبان (ودربھ اور مہاراشٹر میں مراٹھی زبان) بھی پڑھانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے چند برسوں سے مراٹھی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ اس طرح مدرس کو اب درجہ سوم و چہارم میں مراٹھی زبان اور اول تا چہارم جماعت تک انگریزی زبان پڑھانی پڑتی ہے تاکہ طلبہ انگریزی اور مراٹھی سے واقف ہو جائیں، ان زبانوں کی بنیادی باتیں اور کسی حد تک انھیں لکھنا پڑھنا اور سمجھنا آ جائے اور آگے چل کر انھیں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان زبانوں کو کس ڈھنگ سے پڑھایا جائے اور نصاب تعلیم کس طرح مکمل کیا جائے اسکے لئے حکومت اسمارٹ پی۔ٹی اور ''بلبل'' نام سے اساتذہ کو آٹھ تا دس روز کی ٹریننگ بھی دیتی ہے۔ یہ تعلیمی رہنمائی یا تربیت ہر برس مختلف مقامات پر دی جاتی ہے جو اساتذہ کے بہت کام آتی ہے۔ دیہی مدرسوں میں احباب کی باتیں کریں تو بہت سے طلبہ اکثر مضامین میں کمزور رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ مادری زبان تک کا املا نادرست ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے پاس نصاب کے مطابق کتابیں، بیاضیں اور دیگر ضروری اشیاء نہیں ہوتیں جن سے وہ بھرپور تعلیمی فائدہ اٹھا سکیں۔ دیہاتوں میں غربت کی وجہ سے پرائیوٹ ٹیوشن یا کلاسیس کا بھی رواج عام نہیں کہ طلبہ اپنے کمزور مضامین کی کمی کو پورا کر سکیں۔ دیہی ماحول بھی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ کی جانب سے ملنے والی امداد بھی تاخیر سے ملتی ہے ان تمام چیزوں کی عدم دستیابی دیہی پرائمری طلبہ کی تعلیم پیش رفت میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے جس کا اثر معیار پر پڑتا ہے۔ اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دیہی مدرسے اور جسمانی تعلیم: جدید نصاب کے پیش نظر پرائمری مدارس میں جسمانی تعلیم کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے کھیل کود، صفائی، ورزش، پی۔ٹی۔ P. T. اور طلبہ کی مناسب نشوونما کیلئے اوقات مقرر کیے گئے ہیں۔ طلبہ کیلئے تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود اور ورزش بھی بہت ضروری ہیں اس سے وہ چاق و چوبند رہتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی بڑھتی ہے۔ شہروں کے پرائمری مدارس تو اس پر بڑی حد تک عمل کرتے ہیں کہ انھیں سارے وسائل حاصل ہوتے ہیں۔ وہ شہروں میں کھیلے جانے والے کھیلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، ٹ۔وی اور ریڈیو (C.D. V.C.D. وغیرہ بھی) ان کیلئے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اچھا میدان اور قابل اساتذہ کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے اور مواقع بھی ملتے ہیں۔ لیکن دیہی مدارس کے طلبہ ان وسائل اور مواقعوں سے بڑی حد تک محروم رہتے ہیں اور بہت کم اس طرف توجہ دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں نہ ڈرامے کھیلے جاتے ہیں نہ ہی نکو ناٹک اور نہ ہی دلچسپ و موثر تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ وسائل اور تجربات کی کمی یہاں بھی مانع ہوتی ہے۔ کھیل کود، ورزش اور دیگر تقاریب کی اس کمی کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جانی چاہیے تاکہ دیہی مدارس کے طلبہ بھی ان سے استفادہ کر سکیں اور قوم و ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹا سکیں۔

آج وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ نہ صرف دیہی علاقوں بلکہ پورے ملک میں پرائمری اسکول کی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی جائے۔ دیگر ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارے یہاں بھی پرائمری تعلیم کو اتنا موثر اور کارگر بنایا جائے کہ آگے چل کر طلبہ کو کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔ آخر میں ایک گذارش اور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ جسطرح بڑے شہروں اور گاؤوں میں مختلف معروف تنظیمیں ادارے اور سوسائٹیاں بڑے پیمانے پر دیہی علاقوں کا بھی رخ کریں تو معیار تعلیم میں یقیناً بہتری آسکتی ہے۔ شاید کہ کسی دل میں اتر جائے مری بات۔

□□□

پتہ:
Nagarparishad, Urdu Primary School No. 4,
Zeya Colony, Kham Gaon-444303 (Maharashtra)

ریاض احمد

برصغیر میں فاصلاتی تعلیم کا دائرہ

کسی ملک کے تعلیمی پروگرام اس ملک کی سیاسی آزادی، معاشی ترقی اور تہذیبی وسماجی مساوات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ برصغیر کے دیگر ممالک عام طور پر اور ہند و پاک خاص طور سے تعلیمی اعتبار سے ایسے ملک ہیں جہاں رسمی طرز تعلیم اپنے تمام افراد کو تعلیم و تدریس کے زیور سے آراستہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ بظاہر ہماری معاشی حالت ہے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ اس صورت حال میں برصغیر کے ماہرین تعلیم اور منصوبہ ساز افراد دونوں اس بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ اس مسئلے کا واحد حل فاصلاتی نظام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ میں ہی ہے۔ اس لیے برصغیر کے ممالک میں خصوصی طور سے قومی تعلیمی نیٹ ورک میں فاصلاتی نظام تعلیم نہایت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نظام تعلیم کو لے کر شروع شروع میں کچھ خدشات ظاہر کیے جا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ اعلیٰ تعلیم کی Quality of Education میں گراوٹ آئے گی، تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہوگا، دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی اداروں سے فارغ طلبہ کے مقابلے میں ہمارے فارغ طلبہ کا معیار پست رہے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فاصلاتی نظام تعلیم میں جدید تکنیکی صلاحیتوں کے ذریعے ان خامیوں کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی جارہی ہے اور اس ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، دہلی مشعل راہ کا کام کر رہی ہیں۔

فاصلاتی طرز تعلیم کی کامیابی ان تمام تر تکنیکی صلاحیتوں کو وسیع پیمانے پر استعمال میں لانے میں مضمر ہے۔ یہ ایسا آسان اور سستا نیم رسمی طریقہ تعلیم ہے جس میں مالی اور افرادی قوتوں کا کم از کم استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس طرز تعلیم میں ترک تعلیم کی شرح بہت کم ہے اور اس سے ان افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے جنھوں نے کسی وجہ سے اپنی تعلیم درمیان میں ہی نامکمل چھوڑ دی ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ ان سبھی مضامین کی تدریس کا مکمل اور ٹھوس انتظام ہے جن کی ان ممالک کو سماجی، تکنیکی، معاشی اور اقتصادی میدان میں ضرورت ہے۔ فاصلاتی تعلیم میں خود آموز تدریسی مواد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ تعلیم میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یا تو استاد کی ضرورت ہوتی ہی نہیں ہے یا پھر بہت کم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظام تعلیم میں جدید تعلیمی ٹیکنالوجی کے استعمال کی وجہ سے اساتذہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی ترویج وترقی کا سرسری جائزہ لیں تو اس نظام تعلیم نے اب تک ترقی کی پانچ منزلیں طے کر لی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاصلاتی تعلیم کی پانچویں منزل ہمارے سامنے ہے یعنی Inteligent Flexible Learning Model کا استعمال ہمارے بہت سے فاصلاتی تعلیمی اداروں میں شروع ہو گیا ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ فاصلاتی طرز کے سبھی طلبہ کو ان سہولتوں سے فائدہ پہنچایا جائے۔

ادارہ جاتی اور انتظامی لحاظ سے فاصلاتی نظام تعلیم کی تین عملی صورتیں ہیں یعنی اس کی ترویج میں تین طرح کے ادارے کام کر رہے ہیں۔ اول وہ ادارے جنھیں کلی طور پر ہم اوپن یونیورسٹی کہتے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، دہلی اور بنگلہ دیش اوپن یونیورسٹی ـــ اسلام آباد، بی آر امبیڈکر یونیورسٹی ـــ حیدرآباد، نالندہ اوپن یونیورسٹی ـــ پٹنہ وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرح کے ادارے Dual Model Educational Institutions کہلاتے ہیں۔ ان اداروں میں رسمی تعلیم کے شعبے کے ساتھ ساتھ فاصلاتی تعلیم کے شعبے بھی ہوتے ہیں جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ مثلاً Directorate of Distance Education (نظامت فاصلاتی تعلیم)، شعبۂ فاصلاتی تعلیم، اسکول آف ڈسٹنس ایجوکیشن، Centre for Distance & Opern Learning، شعبۂ مراسلاتی تعلیم، Department of Continuing Education وغیرہ۔ ان اداروں کی مثال مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، عثمانیہ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی سے دی جاسکتی ہے۔

فاصلاتی نظام تعلیم میں تیسری طرح کے اداروں کی مثال (NIOS) National Institute of Open Schooling ہے۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں قائم ہے اور اس کے تعلیمی مراکز ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، اس کے ذریعے تقریباً سبھی جدید ہندوستانی زبانوں کو میڈیم بنا کر ثانوی اور اعلیٰ ثانوی امتحان دیے جاسکتے ہیں۔ نیز اس ادارے کے ذریعے اردو زبان کو میڈیم بنا کر طلبہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی امتحان پاس کر سکتے ہیں۔

مختلف ممالک میں فاصلاتی تعلیم کی اصطلاح الگ الگ استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً کہیں مراسلاتی تعلیم، جاری تعلیم، تاحیات تعلیم، آزادانہ تعلیم تو کہیں آزادانہ تعلیمی پروگرام، آف (off) کیمپس تعلیم، ایکسٹینشن تعلیم، Education

In Air وغیرہ۔

برصغیر کے خطے کو زبانوں کا گلدستہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس خطے میں بہت ساری چھوٹی بڑی قدیم وجدید زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ ان سبھی زبانوں میں اردو کو سب سے بڑی رابطے کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ گویا یہ برصغیر کے ہر حصے میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ دنیا میں جو زبانیں رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا استعمال ذریعۂ تعلیم میں بہت مفید ہوتا ہے۔ اردو برصغیر کے سیکڑوں رسمی تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم کی زبان ہے جب کہ متعدد اداروں میں مادری زبان اور جدید ہندوستانی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ فاصلاتی ذریعۂ تعلیم میں بھی بہت سارے اداروں میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے جبکہ متعدد فاصلاتی تعلیمی ادارں میں جدید ہندوستانی زبان اور مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی— اسلام آباد کا شمار جدید فاصلاتی تعلیمی اداروں میں سرفہرست ہے۔ اس کا قیام 1974 میں ہوا تھا۔ یہ ایشیا کی سب سے پہلی اردو میڈیم اوپن یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کے سبھی کورسیز کا میڈیم اردو ہے۔ یہاں تقریباً گیارہ سو کورسیز اردو میڈیم کے ذریعے پڑھائے جارہے ہیں جب کہ تقریباً ایک سو کورسیز کا تعلق صرف اردو زبان وادب سے ہے۔ ان تمام تعلیمی پروگراموں کو مختلف زمروں اور گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

International Marketing Group۔ بین الاقوامی تجارتی گروپ

Population Studies Group۔ مطالعۂ آبادی گروپ

Language and Literature Group۔ زبان وادب گروپ

Mass Communication Group۔ ترسیل عامہ گروپ

Islamic Studies Group۔ اسلامی مطالعہ گروپ

Library and Information Science Group۔ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس گروپ

Social Science Group۔ سماجی سائنس گروپ

اور General & Open Group۔ جنرل واوپن گروپ

یہ سارے گروپ انڈر گریجویٹ پروگرام کے تین سالہ کورس اور پوسٹ گریجویٹ کورسیز پر مشتمل ہیں۔ سبھی کورسیز اور پروگراموں کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں فاصلاتی تعلیم کے ذریعے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم یعنی پی.ایچ.ڈی. تک کا انتظام اردو کے ذریعے ہے۔ یہ ادارہ دور دراز کے گاؤں سے لے کر بڑے بڑے شہروں کے عوام کی ضروریات کے مطابق کورسیز اور پروگرام تیار کرتا ہے۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق یہاں اردو میڈیم کورسیز کی تعداد 1069 ہے جس میں 99 کورسیز اردو زبان وادب سے متعلق ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے 35 ریجنل سینٹر ہیں اور تقریباً 2000 اسٹڈی سینٹر ہیں۔ اب اس ادارے نے بیرونی ممالک میں خاص طور سے خلیجی اور مشرق وسطی کے ممالک میں اپنے ریجنل اور اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کا سلسلہ پاکستان سے قدرے پرانا ہے۔ یہاں 1962 میں سب سے پہلے دہلی یونیورسٹی میں مراسلاتی کورس کے ذریعے اس کی شروعات ہوئی تھی۔ دہلی یونیورسٹی کے بعد ہندوستان نے باضابطہ فاصلاتی نظام تعلیم کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے حیدرآباد میں مکمل اوپن یونیورسٹی 1982 میں قائم کی۔

ایک سینٹرل اوپن یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے علاوہ دیگر 12 اسٹیٹ اوپن یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں جبکہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے متعدد رسمی تعلیم کی یونیورسٹیوں نے اپنے یہاں فاصلاتی تعلیم کے شعبے اور Directorate قائم کیے۔ آج کل ان کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ان سارے اداروں کا نام گنوانا تو اس وقت ممکن نہیں تاہم کل اوپن یونیورسٹیوں کے نام بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کے نام، سال قیام کی ترتیب سے اس طرح ہیں۔

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی دہلی، کوٹا اوپن یونیورسٹی راجستھان؛ نالندہ اوپن یونیورسٹی پٹنہ، یشونت راؤ چوہان اوپن یونیورسٹی ناسک، مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی بھوپال، کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی میسور، بابا صاحب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی احمد آباد، نیتا جی سبھاش اوپن یونیورسٹی کولکاتا، اترپردیش راج رشی ٹنڈن اوپن یونیورسٹی الہ آباد، تمل ناڈو اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی چنئی، اترانچل اوپن یونیورسٹی نینی تال اور پنڈت سندرلال شرما اوپن یونیورسٹی بلاسپور (چھتیس گڑھ)۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا فاصلاتی طریقۂ تعلیم سے اردو کی ترویج وترقی میں مدد مل رہی ہے، تو اس کا جواب ہاں میں ہے۔ اردو زبان کی ترویج وترقی بذریعۂ فاصلاتی تعلیم تین سطحوں پر ہوتی ہے۔

اس طرز تعلیم کے ذریعے تقریباً 25 یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے، جن میں کچھ یونیورسٹیوں میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ، دونوں سطحوں پر اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ کچھ میں صرف انڈر گریجویٹ اور کچھ میں صرف پوسٹ گریجویٹ۔ جن یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ یعنی ایم.اے. اردو کا بذریعۂ فاصلاتی تعلیم انتظام ہے ان کی تعداد تقریباً دس ہے۔ وہ ہیں کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی مظفر پور، للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، مولانا

آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی اور برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال۔ جن یونیورسٹیوں میں انڈر گریجویٹ اردو تعلیم کا بذریعۂ فاصلاتی تعلیم انتظام ہے ان میں کرناٹک اوپن یونیورسٹی، الٰہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، برکت اللہ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، اتکل یونیورسٹی، بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، کیرالا یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، راج رشی ٹنڈن اوپن یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شامل ہیں جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انڈر گریجویٹ کورسیز اردو زبان اور اردو میڈیم میں شروع ہونے والے ہیں۔ جہاں تک اردو میڈیم کا سوال ہے تو انڈر گریجویٹ کورسیز میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اردو میڈیم کی سہولت بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کے اردو میڈیم تربیتی کورسیز یعنی بی ایڈ اور ڈپلوما کا انتظام بھی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ و دیگر ادارے بذریعۂ فاصلاتی تعلیم کرتے ہیں۔

یہاں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس کا سارا تعلیمی نظام اردو میڈیم ہے۔ یہ یونیورسٹی پارلیمنٹ کے ایکٹ نمبر 2 بابت 1997 کے ذریعے 1998 میں قائم کی گئی۔ اس کا دائرۂ اختیار سارا ہندوستان ہے، یہ قومی یونیورسٹی ہے۔ اس کے قیام کے اہم مقاصد ہیں:

(i) اردو کے ذریعے پیشہ ورانہ اور فنی مضامین کی تعلیم و تربیت۔

(ii) اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کے خواہش مند افراد کو کیمپس میں اور اس کے ساتھ مراسلاتی تدریس کے وسیع مواقع فراہم کرنا۔

(iii) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ

اس یونیورسٹی کے پہلے تعلیمی سال 2000-1999 میں داخلہ لینے والے انڈر گریجویٹ طلبہ کی کل تعداد 3650 تھی جبکہ CFN کورس میں داخل طلبہ کی تعداد 124 تھی اور 2004 میں صرف 7 سال کے قلیل عرصے میں اس میں داخل طلبہ کی تعداد 27000 تک پہنچ گئی ہے۔ اس تعداد میں 2007 میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد شامل نہیں ہے کیونکہ یہ ابھی حتمی نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہماری پارلیمنٹ عورتوں کی 33 فیصد سیاسی سیٹ ریزرو کرنے میں قاصر ہے لیکن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے کل داخلوں میں سے 50 فیصد سے زائد داخلہ خواتین کو دیا ہے۔ اس یونیورسٹی نے تقریباً 120 اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں جبکہ اس کے ریجنل سینٹروں کی تعداد 9 ہے، جو پٹنہ، دربھنگہ، دہلی، بھوپال، بنگلور، سرینگر، ممبئی اور رانچی میں قائم ہیں۔ یونیورسٹی نے کئی سب ریجنل سینٹر بھی قائم کیے ہیں جو لکھنؤ، جموں، سنبھل اور نوح میں ہیں۔ یونیورسٹی نے مشرق وسطیٰ میں اپنے تعلیمی مراکز اور امتحان کے مراکز کھولنے کے ارادے کے تحت جدہ میں اپنا امتحانی مرکز قائم کیا ہے۔

برصغیر ہندو پاک میں فاصلاتی تعلیم کے ذریعے اردو زبان کا مستقبل روشن ہے تاہم اس کے لیے اردو اداروں، تنظیموں اور مفکروں کو مزید فعال ہونے کی ہنوز ضرورت ہے۔

□□□

پتہ:
College of Teacher Education
Moulana Azad National University

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس / مترجم: فضل حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔
اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔
ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" کو حاصل ہے۔
صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمس الرحمٰن فاروقی

منظر کاظمی کے افسانے

منظر کاظمی نے بہت کم لکھا، اور جو لکھا بھی، خود انھوں نے اس کی زیادہ قدر نہ کی۔ چھپنے چھپانے سے انھیں بہت رغبت نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اوروں سے زیادہ اپنے لیے لکھتے تھے۔ لکھنا ان کے لیے ذاتی اور انفرادی کارگذاری تھی۔ آخری زمانے میں وہ لکھنا کم و بیش چھوڑ چکے تھے۔ جیسی بیماری میں وہ گرفتار تھے اس میں انسان جینے کی قوت کھو دیتا ہے، لکھنے کی قوت تو بڑی چیز ہے۔ لیکن بیماری کا مقابلہ انھوں نے پامردی سے کیا اور ایک طرح دیکھیں تو ان کی زندگی کے آخری برس ان کا تخلیقی کارنامہ تھے، کہ انھوں نے دم آخر تک بیماری کو زندگی کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا۔ انتقال کے کوئی تین سال پہلے انھوں نے ایک نسبتاً طویل افسانہ لکھا اور مجھے خاص طور پر فون کر کے بتایا کہ تمھارے لیے افسانہ لکھا ہے۔ جب وہ افسانہ میں نے پڑھا تو مجھے اس میں کہیں سے اس بات کا شائبہ نظر نہ آیا کہ اس کا خالق بیمار ہے، یا بیمار ہو سکتا ہے۔ غیاث احمد گدی پر ان کی تحریر بھی زندگی کے تحرک سے بھرپور تھی۔ ان کا جسم ساتھ نہ دے رہا ہو نہ سہی، ان کی تخلیقی قوت میں کوئی تخفیف نہ تھی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ان کے آخری برس بھی ان کی تخلیق کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کا آخری افسانہ، بلکہ آخری دنوں کا افسانہ، جو ان کے بھائی افسر کاظمی نے مجھے "شب خون" میں اشاعت کے لیے ان کے انتقال کے بعد بھیجا، نثر کی اسی شدت اور شعری ارتکاز کا حامل تھا جسے میں ان کی افسانہ نگاری کا ایک بڑا وصف سمجھتا ہوں۔ اور موضوع کے لحاظ سے اس افسانے میں کچھ ایسی آفاقیت تھی کہ وہ افسانہ کئی برس پہلے کا لکھا ہوا ہونے کے بجائے آج ہی لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر مجھے عصمت چغتائی کی بات یاد آئی کہ انھوں نے خالدہ اصغر کے افسانے "سواری" کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ بنگلہ دیش کے واقعات پر لکھا گیا ہے، اگرچہ وہ بنگلہ دیش کے بہت پہلے کی تخلیق تھا۔

میں اس مضمون کو ان کی یادوں سے بوجھل نہیں بنانا چاہتا۔ صرف یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ سیاسی سطح پر میرے اور منظر کاظمی کے خیالات میں بعد المشرقین نہیں تو بہت بڑا فاصلہ ضرور تھا، لیکن اس فاصلے کو پاٹنے کی کوشش نہ کبھی انھوں نے کی اور نہ میں نے، کیونکہ ادبی سطح پر مجھ میں ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ افسانے کو استعارے اور علامت کا رنگارنگ مرقع قرار دیتے تھے، اور میں بھی یہی کہتا تھا۔ افسانہ ہے تو بیانیہ کی ایک صنف، لیکن عام بیانیوں کے برخلاف وہ بالواسطہ اور تہ دار بیانیہ کی اعلیٰ مثال ہے۔ افسانہ اپنے قاری کو ہر بات میں اپنا حلیف اور دوست نہیں سمجھتا۔ افسانہ اپنے قاری کی ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے قاری کے عقائد و تصورات کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا، بلکہ انھیں جھنجھوڑتا، جگاتا، اور مضطرب کرتا ہے۔ ان باتوں پر اتفاق رائے ہونے کے باعث منظر کاظمی اور میرے درمیان تا حیات ایک ذہنی اور روحانی وحدت رہی۔ وہ مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوئے اور میں ان سے کبھی بے دماغ نہ ہوا۔

مجھے اب یاد نہیں آتا کہ ان کی میری دوستی کب شروع ہوئی۔ وہ 1965-1966 کے دن ہی ایسے تھے کہ روز نئے سے نئے ادیب سے ملاقات اور تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کا موقع ملتا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک صلاحیت والا شاعر اور افسانہ نگار ادب کے گلی کوچوں میں اینڈتا پھرتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو گمان تھا کہ ادب میں انقلاب بس آیا ہی چاہتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بعد میں لوگوں نے کچھ بھی کہا ہو اور آج کے لوگ اس کا کچھ بھی مطلب نکالیں، لیکن اس وقت ہم لوگوں کو ایک دوسرے کی سیاست کی فکر نہ تھی۔ جو بھی نیا لکھنے والا تھا، یا جسے بھی خیال تھا کہ میں نیا لکھنا چاہتا ہوں، وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی پر تیار اور مستعد تھا۔ ان میں کئی لکھنے والے ترقی پسند خیالات کے تھے، یا بائیں بازو کی سیاست کے حامی تھے، یا اور کچھ نہیں تو امریکی سامراج کے سخت دشمن تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھیں سیاسی تصورات و نظریات سے کتابی اور نظریاتی دلچسپی تو تھی، لیکن عملی سیاست سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔ ہم میں جو چیزیں مشترک تھیں وہ ادبی تھیں، یعنی غیر قدامت پسندی، تجربے کی فی نفسہ قدر و قیمت، فرد کی آزادی اظہار پر مکمل عقیدہ، اور اپنی بات کہنے کا جوش۔ ایسے میں سب نئے لکھنے والے جو کم و بیش ہم عمر تھے، ایک دوسرے کو دوست سمجھتے اور دوست رکھتے تھے۔ میرا اور منظر کا بھی یہی معاملہ ہوا۔ منظر بائیں بازو کی سیاست کے باعمل پیروکار تھے، لیکن مدتوں تک مجھے اس کی خبر بھی نہ تھی۔ مجھے وہ اچھے افسانہ نگار لگتے تھے اور بس۔ ہماری دوستی شروع ہونے کے کئی سال بعد ایک بار وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ لکھنؤ آئے اور میرے یہاں ٹھہرے، اور مجھے معلوم ہوا کہ ان کے دوست سی پی ایم ہی کی نہیں، بلکہ نکسلی سیاست کے حامی اور اس پر عامل ہیں۔ پھر مجھے پتہ لگا کہ منظر کاظمی بھی کم و بیش انھی خیالات کے ہیں۔ اس پر مجھے نہ کچھ تعجب ہوا نہ برا

معلوم ہوا۔ جدیدیت اور جدید ادب کے بارے میں وہ تلخیاں جو آج کے ''ترقی پسند'' ادیبوں کی تحریر و تقریر سے دن رات ٹپکتی ہیں، اس زمانے میں ان کا وجود نہ تھا۔ یا اگر تھا تو ہم لوگوں کے درمیان نہ تھا۔

منظر کو میں نے علامتی، تجریدی افسانے کے اہم نام کی حیثیت سے جانا۔ انھوں نے نثر میں وہ شعری ارتکاز اور بہاؤ حاصل کرلیا تھا جسے سریندر پرکاش کا طرۂ امتیاز کہا جانا چاہیے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ منظر نے اپنا بیانیہ اسلوب خود ہی دریافت کرلیا ہو۔ یہ اسلوب رہی ''شعریت'' سے متنفر اور شعر کی روح کی سیرابی کا حامل تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ منظر کاظمی کے مجموعے ''لکشمن ریکھا'' کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے اور یہ نظم نعتیہ ہے۔ ان دو باتوں میں منظر کاظمی کی ادبی شخصیت کے بہت سے اسرار پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ایک تو یہ دیکھیے کہ ان کے افسانوں میں روایتی مذہبی تصورات، تلمیحات، اشارے یا علامتیں نہیں ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی داخلی زندگی کی پاکیزگی ان میں جھلکتی ہے۔ وہ ایسی دنیا کا متلاشی ہے جہاں انسان اور انسان، انسان اور کائنات، انسان اور کائنات کے خالق و ناظم کے مابین امن، سلامتی، محبت اور تفہیم کے رشتے ہوں۔ انسان اس کائنات میں گم کردہ راہ نہ دکھائی دے، قعر ضلالت میں کھو نہ جائے، قلب کی دردمندی اور روح کا گداز اس کے رشتوں کو مستحکم کرے۔ ان کے کئی افسانے کسی استفسار پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(1) مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی روشنی کے دیوانے کالے کالے جرنیلوں سے خوف زدہ کیوں ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ تعداد ان کے یہاں کوئی جنس بن گئی؟

یا زمین کی پستیوں میں آسمان بن کر رہنے کا فن لوگوں نے بھلا دیا؟

(سیاہ غلاف اور کالے جرنیل)

(2) اگر یہ بھی سچ ہوگیا کہ ہم اپنا خون بہانے کا فن بھول گئے تو اس کرۂ ارض پر اور کون ہوگا جس سے ہم آنے والی طوفانی راتوں میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے خون کے سمندر کی کہانی کا مطلب پوچھیں گے؟

(ایک کجلائی ہوئی شام)

(3) سوچتا ہوں ضرورت مندوں میں اگر نیند تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو میں کس کو کیا دوں گا؟

(میرے حصے کی نیند)

ان سوالوں کا پوچھنے والا منظر کاظمی ہے اور نہیں بھی۔ یہ سوالات اس انسان کی طرف سے بھی پوچھے گئے ہیں جو خود تو زندہ ہے لیکن جسے اپنے گرد و پیش میں موت کی حکومت نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے مسائل کو ایک بڑے پردے میں لپیٹ کر اپنے ذہن کے کسی کونے میں ڈال دیا ہے، لیکن ان کی جھلک اس کے بیانیہ میں بالواسطہ طور پر آجاتی ہے۔ وہ افسانے کو محض اظہار ذات کے لیے نہیں استعمال کرتا، اگرچہ اظہار ذات بھی اس کے فنی وظائف میں شامل ہے۔ وہ ایسے اظہار ذات کو فضول سمجھتا ہے جس کے ذریعے کشف ذات نہ ہو، یا کم سے کم کشف ذات کی آرزو تو نظر آئے، جیسا کہ ن م راشد کی نظم میں ہے اور پھر یہ آرزو جب متشکل ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ خود قاری بھی اس میں اپنی شکل دیکھ لے۔ ہمایوں اشرف سے ایک گفتگو کے دوران منظر کاظمی نے کہا تھا:

''افسانے کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کا قاری اس افسانے کے ذریعے اپنی ذات سے آشنا ہوتا ہے۔ افسانہ جیسے جیسے اس پر منکشف ہوتا ہے، اس کی ذات اس پر منکشف ہوتی جاتی ہے۔ آدمی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے واقف نہیں ہوتا۔ اپنی ذات سے ناآشنائی کی دھند اسی افسانے کے توسط سے چھٹتی ہے۔''

اب اس بیان کی عملی شکل دیکھیے:

اپنے اظہار میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے ان کی آوازیں پہلے کے مقابلے میں وسعت اختیار کرگئیں اور پیچیدہ ہوگئیں۔ نتیجے کے طور پر خوبصورت پرندوں کے قصے اپنی مقبولیت کھو بیٹھے۔

(ایک پرانی شاخ سے لپٹا ہوا آدمی)

انسان کی زندگی کا انحصار بیانیہ پر ہے۔ منظر کاظمی نے اس حقیقت کو اکثر لوگوں سے بہت پہلے دریافت کرلیا تھا۔ انسان خود کو سمجھنے کے لیے بیانیہ ایجاد کرتا ہے۔ انسان اپنے ماضی کو سمجھنے کے لیے بیانیہ ایجاد کرتا ہے۔ انسان مستقبل کے نقشے اپنے معاشرے میں رائج بیانیوں کی روشنی میں تیار کرتا ہے۔ یہ بیانیہ جتنا وسیع الذیل اور عمومی ہوگا، اس کے غلط ثابت ہونے یا مبنی برناانصافی ہونے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کو سمجھنے اور سمجھانے والا ہر چیز کے بارے میں پیشین گوئی کی صلاحیت رکھنے والا بیانیہ ایجاد یا دریافت کرنا چاہتا ہے۔ منظر کے محولہ بالا افسانے میں اسی المیے کو بیان کیا گیا ہے کہ آوازیں جتنی متنوع ہوتی جاتی ہیں، ان میں خوش آہنگی اور یک جہتی کا امکان اتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔ مینار بابل بھی اسی المیے کی علامت ہے، اور ہمارے زمانے کے بڑے بڑے فلسفے اور اصلاح کے منصوبے اور پروگرام، مارکس سے لے کر لینن اور ماؤ سی تنگ کے دعوے اور ہٹلر سے لے کر جارج بش تک کی سب لن ترانیاں اسی المیے کا اظہار کرتی ہیں۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ منظر کاظمی نے اپنے لیے جو بیانیہ زبان ایجاد کی اس میں شعر کی روح گھلی ہوئی تھی۔ دیکھیے خود منظر کاظمی اس کی توجیہ کس شاعرانہ محاورے میں کرتے ہیں۔ ہمایوں اشرف سے اسی گفتگو کے دوران منظر کاظمی نے کہا:

''شاعری میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ بنیادی طور پر بحر کی زبان

ہوتی ہے اور نثر تو وصل کا نتیجہ ہے، قربت کی دین ہے۔ شاعری اولین ادبی اظہار اس لیے بھی ہے کہ ہم خانہ بدوشوں کی ٹولی ہزاروں سال تک جنگل جنگل گھومتی رہی اور اپنے آپ سے ناواقف ہونے کا درد جھیلتی رہی۔ اپنے ہی جیسے ستم رسیدوں کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔ یہ بھٹکنا ہجر کا بھٹکنا تھا۔ شاعری نے اسی سے جنم لیا۔ وہ زندگی جب ذرا مدھم ہوئی تو ہم نے پڑاؤ ڈالا، ایک جگہ جمے۔ پھر سماج بنا۔ قافلے اور قبیلے پہچانے گئے۔ اظہار کی نئی صورتیں سامنے آئیں۔ یوں آپ آسانی سے نثر کو شہر کی زبان کہہ سکتے ہیں۔"

مندرجہ بالا قول کی تہ میں اتریں تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ منظر کاظمی کی زبان رکی "شعریت" والی زبان نہیں ہے۔ انھوں نے بجا طور پر اس بات سے انکار کیا کہ انھوں نے خلیل جبران کو پڑھنا تو درکنار اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ شعریت جو خیال کی کمی اور مشاہدے کی کمزوری کو ڈھانکنے کے لیے کام آتی ہے، منظر کاظمی کی شعریت نہیں ہے اور نثر کو شعر سے ممیز کرنے، نثر کی پیدائش کے وجوہ بیان کرنے کے لیے انھوں نے جو انسانی تاریخ کی تمثیل بیان کی ہے وہ خود اعلیٰ درجے کی شاعری کا رنگ رکھتی ہے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس میں منظر کاظمی نے انسان کے ادبی اور تہذیبی ارتقا کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ منظر کاظمی نے نثر اور شعر دونوں کے طرز وجود (Ontology) کو شاعر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

منظر کاظمی کا افسانہ "آنکھیں" انسان کی تقدیر کے دو رنگے کھیل کو بیان کرتا ہے۔ جب دو گھروں کے بیچ میں دیوار تھی تو دونوں کی آپسی اجنبیت تکلیف دہ تھی۔ لیکن جب دیوار گرا دی گئی تو پڑوسی کو متکلم کی کمر کا جھکاؤ اور چہرے کی جھریاں نظر آنے لگی ہیں اور وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ہے۔ تنہائی ہو یا ساتھ، دونوں حالات میں انسان کو کسی کمی یا کسی زیادتی کا سامنا کرنا ہے، یہی اس کا مقدر ہے:

"میرے آنگن کی دیوار جب تک قائم تھی، میں اس کے لیے اجنبی تھا اور یہ بات شاید اس کے لیے تکلیف دہ تھی اور اب وہ خوش ہے، بہت خوش۔ میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا اور یہی سوچ کر اس کے قہقہوں میں شریک ہوتا ہوں کہ میری پشت پر شعاعوں کی برسات اور تیز ہو جاتی ہے، پلکیں اور بھی شدت سے چبھنے لگتی ہیں۔ ان آنکھوں کے سامنے میں اتنا بے بس ہوں کہ یہاں سفید جھنڈا لہرانا میرے لیے ممکن نہیں۔"

اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ معاملہ صرف تنہائی اور غیروں (Other People) کی موجودگی کا نہیں۔ سارتر نے کہا تھا کہ "جہنم کچھ نہیں، صرف غیروں کی موجودگی ہے۔" (I lell is other people) یہاں معاملہ یہ بھی ہے کہ وہ جو اپنی دیوار کے پیچھے دبکا بیٹھا تھا، کوئی کاہن تھا، یا اس نے پیغمبری یا اصلاح کے دعوے اور وعدے کیے تھے اور جب اس کا پردہ فاش ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم، اپنے واماندہ حال قبیلے سے بھی زیادہ بے طاقت ہے۔

منظر کاظمی کے افسانے کئی تہوں پر ہم سے گفتگو کرتے ہیں، کئی طرح ہمیں خود پر منکشف کرتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں اب تک انتظار ہے کہ ان جیسا کوئی اور پیدا ہو۔

□□□

29-C, Hastings Road,
Civil Lines,
Allahabad, U.P.

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں "پس نوشت: آج یہ کتاب" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

ف.س.اعجاز

شاعری کا ترجمہ: چند عملی مسائل

نجی تجربات کے حوالے سے

ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ شاعری کا ترجمہ، وہ بھی شاعری میں، خصوصاً زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر یہ کام آسان ہوتا تو جتنی انگریزی نظمیں اب تک مجھے پسند آئیں میں نے ان سب کا اردو میں ترجمہ کرلیا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ جس ادب پارے کو میں نے پسند کیا اس نے اگر میرے جذبے کو بھی اکسایا اور مجھ سے میری زبان میں اپنے اظہار کا راستہ مانگا اور مجھے لگا کہ میں اس تقاضے کی تکمیل کر پاؤں گا تبھی میں نے اس ادب پارے کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ یعنی میں ترجمے سے پہلے تخلیق سے مانوس ہوجانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب تک تخلیق اور ترجمہ ایک ہی ذہنی افق پر نظر نہ آنے لگیں، ترجمہ خصوصاً شاعری کا ترجمہ، اثر کو ترستا رہے گا۔

ترجمہ یوں تو ایک زبان سے دوسری زبان میں متن کی لسانی اور معنیاتی منتقلی کا نام ہے لیکن اس کا ایک منصبی پہلو بھی ہوسکتا ہے اور وہ ہے اصل زبان کی ادبی صفات اور اس زبان سے وابستہ تہذیبی قدروں سے حصولِ آشنائی۔ مثلاً کالی داس یا رابندر ناتھ ٹیگور کے شہکاروں کے ترجمے کے ذریعے ہم سنسکرت اور بنگلہ کے شعری نظام کے علاوہ مخصوص عہد کے مخصوص کلچروں کی نمائندگی کرنے والے دو فنکاروں کے طرزِ فکر اور عالمِ خیال سے آگاہ ہوسکتے ہیں۔

ترجمہ برائے ترجمہ، برائے تفریحِ طبع کوئی اہم مقصد نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس ترجمے کے ذریعے کسی بڑے مقصد کی تکمیل مترجم کی ذولسانی فہم اور فطری اپج پر منحصر ہوتی ہے۔ یعنی جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے ان دونوں کی اتنی سدھ بدھ مترجم کو ہونی چاہیے کہ وہ ایک طرف اصل متن کے اشارات و مفاہیم وصول کرسکے اور دوسری طرف ان موصولہ اشارات و مفاہیم کو اپنی زبان میں ادا کرسکے۔

دیگر زبانوں سے اردو میں شاعری کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے کچھ باتوں کا بطور خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً اصول ترجمہ، ترجمانی، اسلوب ترجمہ (پابند یا غیر پابند وغیرہ)۔ انگریزی اور دیگر زبانوں کی کلاسیکی اور جدید شاعری میں اوزان و بحور کا التزام کیا جاتا ہے اور نہیں بھی کیا جاتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا ہے کہ ایک نظم بیشتر پابند ہوتی ہے لیکن بیچ بیچ میں معریٰ یا نثری شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی نظموں میں دو یا دو سے زائد بحریں بھی استعمال ہوئی ہیں جس کا ایک مقصد مروجہ فارم سے انحراف ہے تو دوسرا مقصد پیرایۂ اظہار میں قصداً ایک سے زیادہ "لہجوں" کے استعمال سے نظموں کی ساخت اور آہنگ کو متاثر کرنا ہے تاکہ اصوات و الفاظ کھردرے پن سے یکسر عاری نہ ہوں۔ ممکن ہے اسے اصل زبان کی شعری خصوصیت قرار دیا جائے لیکن کوئی اسے عجزِ شاعر پر بھی محمول کرسکتا ہے۔ ایسے بعض مواقع پر ترجمے کا آہنگ بھی کسی لغزش یا ناہمواری کا شکار ہوسکتا ہے۔ لیکن ترسیلِ معانی، مجموعی تاثر اور کائناتِ نظم کی ترجمے میں منتقلی وہ اہم چیزیں ہیں جن پر ترجمے کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ مترجم اگر شاعر بھی ہو تو شاعرانہ صلاحیت اس کام میں اس کی معاون بھی جائے گی۔

پیرافریز (Para Phrase) یعنی کسی عبارت کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کرنا ترجمے کی آسان منزل ہے لیکن شاعری کے ترجمے میں فارم کی شرط لگا دی جائے مثلاً انگریزی سانیٹ کا ترجمہ اردو میں بھی سانیٹ ہی میں کیا جائے تو مترجم کو واقعی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ انگریزی میں چودہ سطروں میں کہی گئی نظم کا ترجمہ اردو میں چودہ مصرعوں میں ہی مکمل ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ وہ بھی ہیئت کے التزام کے ساتھ کہ چار چار مصرعوں کے تین بند قوافی و ردائف کے ساتھ مکمل ہوں، پھر دو مصرعے مطلعِ غزل یا مثنوی کے شعر کی طرح موزوں کیے جائیں۔ لفظ بہ لفظ، مصرع بہ مصرع ترجمہ غالباً ممکن نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں مترجم زیادہ سے زیادہ متن کے مجموعی مفاہیم کی ادائیگی اور اردو کی شعری و عروضی پاسداری کے سوا کیا کرسکتا ہے۔ یعنی پیرافریز سے بچ کر چلنا صرف مترجم کے ارادے اور صلاحیت پر منحصر نہیں ہے۔ میں نے ولیم شیکسپیئر کے چند سانیٹ اردو میں ترجمہ کیے تو بڑی مشکلوں سے دوچار ہوا۔ لغت بھی میری زیادہ مدد نہیں کرتا تھا۔ ایک تو سوا چار سو سال پرانی انگریزی وہ بھی شیکسپیئر کے طرزِ خاص میں، ویسے بھی میں انگریزی ادب کا طالب علم کبھی نہیں رہا۔ بس یہ زبان کالج اور یونیورسٹی میں میرا میڈیم تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے۔

خیر، میں اپنا ایک تجربہ بیان کر رہا تھا۔ میں نے اصل متن کے کلیدی مصرعوں کو اردو مصرعوں میں اس طرح موزوں کیا کہ معناً دونوں قریب قریب متبادل کہلائیں۔ پھر سانیٹ کے اصل مقصد اور شاعر کے لب و لہجے کو بہت انہماک سے دیکھا۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن ایسا محسوس ہوا کہ شیکسپیئر جیسا

بڑا شاعر بھی عام شاعروں کی طرح بیچ بیچ میں کچھ بے ربط یا اول فول کہہ جاتا ہے جس سے صرف نظر کرنا مترجم کے لیے بہرحال جائز نہیں لیکن جس صنفِ سخن میں ترجمہ کیا جارہا ہے اس کی پابندی اور خود ترجمے کی اثر پذیری کا خیال مترجم کو قدرے رد و کد پر مجبور کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں تعقیدِ لفظی کا سہارا لیا جائے تو بہتر ہے، یعنی الفاظ اپنے صحیح مقام سے آگے پیچھے کردیے جائیں تو کسی حد تک بات بن سکتی ہے۔ یہاں آکر پیرافریز سے ہٹ کر خلاصہ آرائی کا کوئی طریقہ مترجم کو حسب حال خود دریافت کرلینا پڑتا ہے جس سے اصل متن اور ترجمے میں مطابقت اور انحراف کا کوئی خوشگوار اور معاون پہلو برآمد ہوسکتا ہے۔ مطابقت اور انحراف کی ایک ملی جلی مثال شیکسپیئر کے ایک سانیٹ اور میرے ترجمے کے دو ٹکڑوں میں ملاحظہ فرمایئے:

Those parts of thee that the world's eye doth view
وہ پہلو ترا دنیا کی آنکھیں جسے دیکھیں

Want nothing that the ghought of hearts can mend;
محتاج نہیں لوگوں کے کلماتِ رفو کا

All tongues - the voice of souls - give thee that due,
سچ بول دے جب خلقِ خدا خود ترے حق میں

Uttering bare truth, even so as foes commend.
کلمہ پڑھے دشمن بھی ترے جوہرِ خو کا

اس مثال میں خصوصاً تیسرا مصرع مفہوم کی ترجمانی ہے، الفاظ کا لغوی ترجمہ نہیں ہے۔ اب اسی سانیٹ میں بند نمبر دو میں اصل اور ترجمے میں کچھ زیادہ مطابقت کا نمونہ دیکھیں۔

Thy outward thus with outward praise is crown'd;
ظاہر کو ملے ظاہری توصیف کا اک تاج

But those same tongues that give thee so thine own,
لوگوں کی زبانیں جو کبھی کرتی ہیں تائید

In other accents do this praise confound
گر ٹھان لیں کردیتی ہیں عزت کو بھی تاراج

By seeing farther than the eye hath shown.
جب آنکھوں کو ہر بات سُجھا دیتی ہے تنقید

اس کے بعد شیکسپیئر کے سانیٹ سے اردو سانیٹ میں میرے ترجمے کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ یہ ترجمہ شاید اصل سے زیادہ قریب ہے۔

Why is my verse barren of new pride,
جانے کیوں ہیں میری نظمیں نئے فخر سے عاری

ہر ہونی انہونی سے ہوں کیوں اتنا بیگانہ

Why with the time do I not glance aside
سے کی بدلی دھارا دیکھوں ایسی خو نہیں ڈالی

To new-found methods and to componds strange?
نئی نئی ترکیبوں سے ہوں میں بالکل انجانا

Why write I still all one, ever the same,
کیوں لکھتا ہوں جانے اب تک وہی ایک سے بول

And keep invention in a noted weed,
وہی پرانا سبزہ میرا امیدانِ تحقیق!

That every word doth almost tell my name,
اک اک اکثر پیٹے میرے اپنے نام کا ڈھول

Showing their birth, and where they did proceed?
کتنی دور کی راہی ہوگی میری ہر تخلیق؟

O! know sweet love, I always write of you,
لیکن اے محبوب ہمیشہ تری ہی باتیں لکھتا ہوں

And you and love are still my argument;
تو اور تیری پیت ابھی تک میرا ایک سوال

So all my best is dressing old words new,
اسی لیے تو شبد پرانے پھر سے سجاتا رہتا ہوں

Spending again what is already spent:
تا کہ جس کو خرچ کیا پھر خرچ کروں وہ مال

For as the sun is daily new and old,
جیسے سورج روز نیا ہے، جیسے روز پرانا

So is my love still telling what is told.
میری پیت کا کام ہے پچھلے قصے کو دہرانا

پہلے سانیٹ کی انگریزی زبان ادق ہے اور شعری ساخت پیچیدہ ہے۔ دوسرے سانیٹ کی اصل زبان نسبتاً صاف اور رواں ہے اور ساخت بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں ترجمے کے منظوم پر جو اثر پڑسکتا تھا وہ ترجموں سے واضح ہے۔ اگر ترجمہ نثر میں کیا جاتا تو اصل متن پورے کا پورا اردو میں اپنے معانی کے اختصاص کے ساتھ منتقل ہوجاتا لیکن وہ کسی رومانی تاثر سے محروم ہوتا۔ دوسرے سانیٹ کے مصرعۂ اولیٰ کا ترجمہ میں نے اولاً یہ کیا تھا: ''جانے کیوں ہیں میری نظمیں نئے رنگ سے خالی'' اور یہی چھپا بھی تھا۔ یہی مجھے زیادہ پسند بھی ہے۔ انگریزی میں ''کلر آف پرائڈ'' اکثر پڑھا بھی ہے۔

لیکن یہاں میں نے ترجمہ بدل دیا ہے اور اپنی ترجیح ختم کر دی ہے۔

مترجم کو آزادی ملنی چاہیے کہ وہ دورانِ ترجمہ اصل متن کے کسی نقص و سقم کا اسقاط کر کے اس عیب کو موروثی بننے سے روک دے۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال ہے، ضروری نہیں کہ کوئی اس سے اتفاق کرے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ شاعری میں اگر خیال کی آمد ہوتی ہے تو ترجمے میں اسی خیال کی دوبارہ آمد ہوتی ہے جس سے مترجم اور صرف مترجم کو سروکار ہوتا ہے جس کے سامنے اس کے اپنے قارئین ہوتے ہیں۔

کہیں کہیں مثلاً ٹی ایس ایلیٹ کی نظموں میں اصل متن کی خصوصیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے درمیان میں دو ایک جگہ اوزان کی پابندی کو توڑنا پڑا۔ مضمون کی ابتدا میں اس طرف میں نے اشارہ بھی کیا تھا۔ شاید یہ میری اپنی کسر رہی ہو یا پھر اس "شکستِ وزن" کو منظوم ترجمے کی مجبوری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایلیٹ ہی کی نظم "The Hollow Men" میں تین جگہ اوزان تبدیل ہوئے ہیں۔ (بحر کی تبدیلی نظم گوئی میں نئی نہیں ہے اور نہ یہ عیب ہے، ساحر لدھیانوی کی طویل نظم "پرچھائیاں" ملاحظہ فرمائیں)۔ جی چاہتا ہے یہاں مذکورہ نظم کا ایک اقتباس اپنے ترجمے کے ساتھ پیش کروں۔ چنانچہ نظم "The Hollow Men" (کھوکھلے لوگ) کی چوتھی فصل ملاحظہ فرمائیں:

The eyes are not here
There are no eyes here
In this valley of dying stars
In this hollow valley
This broken jaw of our lost kingdoms

In this last of meeting places
We grope together
And avoid speech
Gathered on this beach of the tumid river

Sightless, unless
The eyes reappear
As the perpetual star
Multifoliate rose
Of death's twilight kingdom
The hope only
of empty men.

ترجمہ — آنکھیں یہاں نہیں ہیں
اس جا نہیں ہیں آنکھیں
دم توڑتے سسکتے تاروں کی وادیوں میں
اس کھوکھلی زمیں پر
اس کھوئی مملکت کے اجڑے ہوئے کنارے
اپنے وطن کی گویا اس آخری جگہ پر
اک دوسرے کو اپنے ہاتھوں سے ہم ٹٹولیں
ہونٹوں سے کچھ نہ بولیں
چڑھتی ہوئی ندی کے ساحل پہ چپ لگائے
ہم لوگ بے بصارت یونہی کھڑے رہیں گے
جب تک نہ لوٹ آئے
بینائی پھر ہماری
اور دائمی ستارہ
اس موت کے جہاں میں
ناچیا جھپٹے کے
اوراقِ گل نہ پلٹے
ہر خالی آدمی کی
امید بس یہی ہے!

اس کے بعد نظم کا پانچواں اور آخری حصہ آتا ہے جس کے آغاز اور انجام میں ایلیٹ نے چار چار سطروں کا ایک ایک بند تحریر کیا ہے۔ پوری نظم معریٰ اور ایک بحر میں ہے لیکن یہ دو بند علاحدہ بحروں میں ہیں، اور دونوں بند ایلیٹ نے Italics یعنی ترچھے خط میں لکھے ہیں۔ ان میں سے پہلا بند دیکھیے جو پانچویں حصے کا آغاز ہے:

Here we go round the prickly pear
Prickly pear prickly pear
Here we go round the prickly pear
at five O'clock in the morning.

اس بند کا ترجمہ میں نے خطِ نسخ میں ایک معمولی حذف کے ساتھ کیا ہے۔ دو لفظ "Five o'clock" میں نے حذف کیے ہیں لیکن ترجمے میں وقت کا وہی تصور یا احساس آپ کو ملے گا جو اصل متن میں پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ناشپاتیاں دینے والا خاردار اک پیڑ
جب ہوتی ہے صبح کی بیلا جب ہوتی ہے بھور
گشت لگانے آجاتے ہیں ہم اس پیڑ کی اور
ناشپاتیاں دینے والا خاردار اک پیڑ

اب پانچویں حصے کا آخری بند جو نظم کا بھی آخری بند ہے، نقل کر رہا ہوں۔

This is the way the world ends
This is the way the world ends
This is the way the world ends
Not with a bang but a whimper.

اسی طرح مرتی ہے دنیا
اسی طرح مرتی ہے دنیا
اسی طرح مرتی ہے دنیا
کوئی دھماکہ شور کیے بن
ریں ریں کرکے مرجاتی ہے

دو باتوں پر غور فرمائیں۔ خوش آہنگی کی خاطر شاعر کے چوتھے مصرعے کو میں نے قصداً دو لخت کرکے دو مصرعے بنا دیے ہیں تاکہ ''اسی طرح مرتی ہے دنیا'' کی تین تکراروں سے اردو ترجمہ کرکرانہ ہو جائے اور یہ تکرار محض اصرار میں بدل جائے۔ دوسری بات یہ کہ ان مقامات پر شاعر کی وضاحت کے بغیر پس منظر سے کورس آوازوں کے ابھرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہاں صوتی آہنگ اور تال پر مترجم کو عبور ہونا چاہیے۔ میں نے اس کا دھیان رکھا ہے۔ (اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ایلیٹ کی عصری حسیت سے بھرپور اس نظم کے چار مختصر بند جو ان دونوں بند کے درمیان آتے ہیں میری نظر میں اعلیٰ درجے کے شہ پارے ہیں)۔

یہ واضح رہے کہ اگر اصل سے راست ترجمے کے بجائے ترجمے سے ترجمہ کیا جارہا ہو اور اس درمیانی ترجمے میں کوئی لفظی یا معنوی نقص رہ گیا تھا تو مترجم کو وہاں الجھن ہو سکتی ہے۔ کہیں کہیں متن کے کسی ٹکڑے کو ترجمے کا بہاؤ قبول نہیں کرتا اور اگر اس ٹکڑے کا ترجمہ کردیا جائے تو ترجمے کی ترکیب بگڑ سکتی ہے۔ کہیں محض ایک لفظ کی تبدیلی سے ترجمہ نظم کی معنویت اور ترسیل کے لیے جادو اثر ثابت ہوتی ہے۔ سلومیجا نیرس (Salomeja Neris) لتھوانیا کی رومانی شاعرہ کی ایک پرسوز و پرکیف نظم کا عنوان "Twenty Sou" ہے۔ نظم 1937 میں لکھی گئی۔ اس میں لتھوانیا کی کرنسی کا نام 'Sou' (بروزن 'You') تھا یا ہے۔ روسی مترجم دوریان روٹمبرگ (Dorian Rottenberg) نے 1987 میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ میں نے اس کا اردو ترجمہ 1991 میں کیا۔ ماجرا یہ ہے کہ پیرس کی سڑکوں پر ایک گل فروش لڑکی یا عورت صبح سے کچھ پھول بیچنے کی ناکام کوشش میں تھک گئی۔ بیس سو کے پھول اس کا اثاثہ تھے جنھیں وہ دن بھر میں فروخت نہیں کرپائی اور اپنی یومیہ آمدنی سے محروم رہی۔ اس کی مایوس طبیعت پر ایسا تاثر چھوڑ جاتی ہے کہ ناظرین مغموم ہو جاتے ہیں۔ پانچ بند کی پابند نظم کا ترجمہ میں نے پانچ بند کی پابند نظم میں کیا ہے۔ ہر بند کے چوتھے مصرعے میں "For only twenty sou" کی تکرار سے گل فروش یا مالن کی محرومی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب ''سو'' کو ہمارے یہاں کون جانتا ہے؟ ڈالر، پونڈ وغیرہ تو سب جانتے ہیں۔ چنانچہ "For only twenty sou" کا میں نے ''بیس روپیوں کی اک رقم کے لیے'' ترجمہ کردیا۔ پیرس میں روپیوں کا ذکر بے محل ہے لیکن بہ حیثیت مترجم میرے سامنے میرا اپنا مسئلہ تھا۔ صرف ''سو'' کو ''روپیوں'' سے بدل دینے سے میرا یہ ترجمہ بے حد سراہا گیا کیونکہ ہر پھر کر اس نظم میں جذبہ و احساس کو انگیز کرنے والا یہ لفظ کلیدی ہے اور اسے ہندوستان پاکستان وغیرہ میں ہر زبان کا ہر فرد جانتا ہے۔

دراصل یہ نظم انوکھی کیفیت کی نظم ہے۔ پھول رومان اور حسن کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ سن سینتیس کی نظم ہے۔ معاشرے میں کس طرح کا مالی بحران رہا ہوگا جب ایک حسینہ کے ہاتھوں لوگ دن بھر میں بیس روپے کے پھول نہیں خرید پاتے ہوں گے۔ اس صورت حال میں نسائی لہجے میں غم و یاس کا اظہار ملاحظہ فرمائیے:

The passers-by won't answer,
I don't know what to do.
I'm freezing here since morning
For only twenty sou.

راستہ چلتے لوگ بھی چپ ہیں
بجھ گئے میری آرزو کے دیے
صبح سے میں بھٹک رہی ہوں یہاں
بیس روپیوں کی اک رقم کے لیے

تیسرے مصرعے کا ترجمہ دراصل یوں کرنا چاہیے تھا: ''صبح سے منجمد کھڑی ہوں یہاں''۔ یہاں مجھ سے ایک چوک ہوئی۔ اس نظم کا ترجمہ میں نے پیرس کی سیر کے بعد کیا تھا۔ وہاں ایک جگمگاتی رات میں شانزا ایلیزے کی شاہراہ پر میں نے ایک گل فروش کو گشت کرتے ہوئے پھول بیچتے دیکھا تھا۔ شاید بوقت ترجمہ اس کی بھاگ دوڑ کی تصویر میرے ذہن میں ابھر آئی اور مصرعے میں دو لفظ بدل گئے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تخلیقی ترجمے میں کبھی کبھی مترجم کا اپنا کوئی مشاہدہ یا کیفیت چپکے سے داخل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔ (اس کا احساس مترجم کو بعد میں بھی ہو سکتا ہے)۔

اس طرح ''تحریفِ نازک'' کی چند اور مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ واضح رہے میں نے تحریفِ نازک کہا ہے تحریفِ خفی نہیں۔ تحریفِ نازک سے یہاں میری مراد تحریف برائے نزاکت و لطافتِ فن ہے۔ میرے ایک مقامی دوست سبرتو بندوپادھیائے بنگلہ اور انگریزی میں جدید شاعری کرتے ہیں۔ ان کی فرمائش پر میں نے ان کی کئی نظموں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جہاں کہیں علامات و استعارات کے ترجمے کی مشکل درپیش آتی ایسا لگتا کہ مجھے کمبل

اوڑھ کر کسی غار میں کشفِ معنی کے انتظار میں بیٹھے رہنا پڑے گا۔ ابہام کو خوبصورت اور کارآمد بنانا بھی مترجم کی ذمے داری ہوسکتی ہے۔ یہاں کسی خاص تفصیل میں نہیں جاتا ہے۔ علامت نگاری کے ذکر سے الگ ایک چھوٹا سا تجربہ بیان کرتا ہے۔

میرے دوست کی ایک نظم کا عنوان تھا "A play, a play"۔ نظم میں جو کچھ ہے مصنف اس سے مراد لیتا رہا ''ایک کھیل، ایک کھیل''۔ کھیل کیسا؟۔ جنسی خواہش اور پیار کے کھیل کی ہی ہے لیکن آغاز میں سمندری جہاز کے عرشے پر معشوقہ کے جنیو بجانے کا ذکر بھی آیا ہے کہ وہ کچھ بھی اور آوارہ دھنیں چھیڑ چھاڑ کا، پیار محبت کا۔ میں نے اس کی یہ نظم بار بار پڑھی تو دیکھا بات تو اس میں جنسی بجا رہی ہے۔ میں نے اس نثری نظم کا نثری نظم میں ترجمہ کر دیا اور اس کو عنوان دیا ''ایک دھن، ایک کھیل''۔ انگریزی میں موسیقی کا آلہ بجانے کے لیے بھی'' پلے'' کا ہی لفظ آتا ہے۔ جب شاعر کو میں نے اس انگریزی عنوان کا یہ اردو ترجمہ بتایا تو وہ اس معنوی تصرف پر چونکا اور خوش بھی ہوا۔ اپنے ہی عنوان کی معنوی ہوجت اس کے دامِ خیال میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح مترجم سے فروگذاشت ممکن ہے اسی طرح شاعر سے بھی فنی چوک ہوسکتی ہے۔ اسی لیے میں نے اوپر لکھا ہے کہ مترجم متن کے ثقل اور سقم پر بھی نظر رکھے اور اسے ہٹا دے تو کچھ برا نہیں ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے ترجمہ اور نکھر جائے۔ خصوصاً تجریدی تخلیق کے ترجمے میں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے۔

ترجمے کے دوران اپنی زبان کے محاورات اور روزمرہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس سے ترجمے میں چاشنی، نکھار اور سلجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ صرف متبادل کے استعمال سے بات نہیں بنتی۔ ترجمے کے الفاظ کو پوری نظم کی صورت حال کا عکاس بھی ہونا چاہیے۔ ایدوَرڈس مائزے لائنس کی ایک انقلابی روسی نظم میں نے انگریزی ورژن سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ جس کا مقصد ہے اسے ایک خندق میں زندہ دفن کیا جانے والا ہے۔ وہ جیالا بار بار دشمنوں کو للکارتا ہے'' یہ پٹی کھول دو۔ یہ پٹی کھول دو''۔ نظم کی ارتقائی کیفیت اعلیٰ درجے کی سرجوشی سے پُر ہے۔ اس نظم کو میں نے'' میری آنکھیں کھول دو!'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اور آنکھوں پر پٹی بندھنا یا آنکھوں سے پٹی کھلنا وغیرہ اردو محاوروں سے استفادہ کیا۔ ذرا سے طنز کی شمولیت سے مفہوم میں ایک نوکیلا ابھار پیدا کرنا مقصود تھا کہ پٹی دراصل سرفروش کی آنکھوں پر نہیں ظالموں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے۔ پوری نظم دہرائے بغیر میں اپنے استدلال کو ثابت نہیں کرسکتا۔ لیکن نظم طویل ہے اس لیے صرف اس کا کلائمکس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

"Take off your rag! To meet death blind
is beneath man's dignity.
Allow these bitter tears of mine to dry up in the wind.
I loved this life too much - I'll die
in proud tranquillity.
I lived for life's sake - in life's name
Today I meet my end.
"Take off your rag, you murderers! Don't hide your faces, you!
I'll look into the eyes of those
who my death-sentence signed.
"Take off your rag - I want to know, who at this hour fears who?!
And so I tell you one more time:
Untie, untie these eyes of mine!"

اب آپ ترجمے پر غور فرمائیں کہ کس طرح تخلیق سے زیادہ ترجمے میں لفظوں کے حرکی پہلو پر زور صرف کرنا سود مند ہوسکتا ہے اور تعقیدِ معنوی کی بھی ترجمے میں بڑی اہمیت ہوجاتی ہے۔

''تم نے باندھی ہے جو پٹی کھول دو!
اندھی آنکھوں موت سے ملنا ہے جو
وہ قابلِ تحقیر ہے
میرے کڑوے آنسوؤں کو
خشک ہونے دو ہوا میں
زندگی کو میں نے چاہا ہے بہت
مجھ کو یہ اعزاز ملنا چاہیے
مر سکوں اک پُرسکوں انداز سے
زندگی کے واسطے جیتا رہا
زندگی کے نام پر مرتا رہا [یہاں مرنا محاورتاً جینے کے معنی میں ہی آیا ہے]
آج ملنا ہے مجھے انجام سے
''اپنی پٹی کھول دو تم قاتلو!
اپنے چہرے مت چھپاؤ بزدلو!
جھانکنا ہے ان کی آنکھوں میں مجھے
دستخط میری سزائے موت پر جن کے ہوئے
اپنی پٹی کھول دو اے قاتلو!
میں بھی دیکھوں کون کس سے ڈر رہا ہے اس گھڑی؟
اس لیے اک بار پھر کہتا ہوں میں
میری آنکھیں کھول دو، ہاں میری آنکھیں کھول دو!''

چلی کے نامور شاعر پابلو نرودا (1904-1973) کی ایک نظم "Tonight

"....I can write" کے ترجمے کی کوشش میں نے بارہا کی۔ یہ نظم میں نے پہلی بار 1982 میں پڑھی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے سات آٹھ برسوں میں اس کے چند مصرعے اوزان بدل بدل کر میں نے اردو میں موزوں کیے تھے لیکن ترجمہ مکمل نہیں ہو پاتا تھا۔ نظم مجھے بہت اپیل کرتی تھی اور جب کبھی میں بر ودا کی کتاب ہاتھ میں لیتا ایک بار وہ نظم ضرور پڑھتا تا آنکہ اکتوبر 2003 کی ایک شب میں مجھے احساس ہوا کہ میں اتنے برسوں سے محض شاعر کے لفظی پرندوں کے دُم پکڑنے کی کوشش کرتا آرہا ہوں۔ اس کے لہجے کا تعاقب کبھی نہیں کیا۔ اس بار میں نے اس کے لفظوں کے برعکس اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ، وقفوں اور سکوت کو اپنے ترجمے میں دہرانے یا داخل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا [اور یہ مکرر عرض ہے] کہ شعری ترجمے میں کبھی کبھی زبان سے زیادہ اہمیت اصوات اور رموز و اوقاف کی ہوتی ہے۔ کسی اجنبی (Alien) زبان سے قارئین کی شناسائی کے نفسیاتی پہلوؤں کی فہم مترجم کی کامیابی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ برودا کی اس نظم کا ترجمہ میں نے "آج کی رات میں لکھ سکتا ہوں......" عنوان کے تحت کیا ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ شاعری کا ترجمہ قانون کی کتاب (Statute book) کے ترجمے سے الگ کام ہوتا ہے۔ اس میں جذبات کی لہریں اوپر نیچے چلتی رہتی ہیں۔ ہر ملک کی شاعری اس کے عوامی کلچر اور طرز فکر سے متاثر ہوتی ہے۔ اس میں مقامی علائم و استعارات بھی بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں۔ ان باتوں کے علم کے ساتھ ادب کی گلوبلائزیشن کے لیے ایک زبان کے شہکاروں کو دیگر زبانوں میں منتقل کرنا ضروری ہے اور اس ضمن میں ترجمے کو تخلیق سے معاونت کرنا چاہیے۔ اس کی کئی صورتوں اور ضرورتوں پر اپنے تجربات کے حوالے سے میں نے روشنی ڈالی ہے اور یہ ایں ہمہ مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے۔

□□□

پتہ:
Insha Publications,
25-B, Zakaria Street,
Kolkata-700073

مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

مصنف: وہاب قیصر

"مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت" میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کی سوانح، تحریریں، صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج، سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انھیں ضبط تحریر کیا ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موصوف نے مولانا کے لیے سائنس کی تعلیم کا حصول، مولانا آزاد کا سائنسی شعور، غبار خاطر سائنس کے تناظر میں، البیرونی اور جعفر بفیۂ عالم اور مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔

صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے

تاریخ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نور اللہ/ جے. پی. نائک
مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیم نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 552، قیمت: -/111 روپے

بشریٰ اعجاز

کس بھول کو اوڑھے سوتی ہو؟

دہلی کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مگر مجھے وہ شہر اس لیے بھی بہت پسند تھا کہ وہاں اس عہد کی دو عظیم ادیبائیں رہتی تھیں۔ امرتا پریتم کا گھر حوض خاص میں تھا اور قرۃ العین حیدر نوئیڈا میں رہتی تھیں۔ حوض خاص کا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے مگر نوئیڈا جانے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس لیے میں نہیں جانتی اردو زبان کی وہ ادیبہ جس نے اردو ناول اور کہانی کو بے پناہ وقار بخشا اور اپنی تحریروں سے دو صدیوں کو متاثر کیا، اپنی زندگی کے آخری ایام نوئیڈا کے جس چھوٹے سے فلیٹ میں گزارتی رہی، وہ کیسا تھا۔ اس پرشکوہ زندگی کا انجام کیسا تھا جو ازابیلا تھوبرن کالج لکھنؤ، نہٹور، سولن، دہرہ دون، شملہ اور ضیا برج کلکتہ سے آغاز ہوتی ہے اور سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد جیسی نابغۂ روزگار شخصیات کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہے۔ دنیا میں اپنی بے پناہ موجودگی کا اعلان کرتی جب دہلی میں قیام پذیر ہوتی ہے، تو اس کی حقیقی تصویر کیسی بنتی ہے۔ وہ زندگی جس کے متعلق اپنے سوانحی ناول" کار جہاں دراز ہے" کے ابتدائیہ میں قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے" اللہ کے نیک بندوں نے حمد و مناجات، عبادت و خدمت خلق میں زندگیاں کردیں۔ نہ دنیائے دوں بدلی نہ سلسلۂ علت و معلول، اور فرشتے ہیں کہ لکھے چلے جارہے ہیں۔ ناحق پکڑواتے ہیں، پلٹ کر بندۂ خاکی سے نہیں پوچھتے کہ میاں! تم اشعریہ تھے کہ معتزلہ، جبریہ ہو یا قدریہ۔ مومن ہو یا مشلک، کیونکہ کوئی فرق نہیں پڑتا اور ایک موونگ فنگر ہے جو لکھ کر آگے سرک جاتی ہے۔" کیا عجب المیہ ہے اس موونگ فنگر کا بھی جو کیسے کیسے زمانے، تہذیبیں، تمدن اور ہستیاں کھا کر آگے بڑھ گئی ہے۔ یوں جیسے اس کا کسی چیز سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، مگر وہ جن کے ہاتھ میں لوح تو دی نہیں مگر قلم دے دیا، انھیں راوی بنا دیا، حکایتوں کو جاننے اور لکھنے کا روگ لگا دیا، چلو شاباش، لکھتے چلو، سو یہ لکھتے چلے گئے۔ حقیقت کی دوسری جہات اور تہوں کی تلاش کے لیے جستجو کی مشعلیں جلائیں اور سچائی کی کھوج میں وقت کی اندرونی ہفت خواں طے کرنے کے کام پر لگ گئے اور کسی کا تو پتہ نہیں مگر قرۃ العین کے بارے میں یہ بات قطعیت سے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اس ہفت خواں کو آدھا پونا ضرور طے کرلیا تھا اور وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے ادبی ایڈونچر کا نام دیتی تھیں اور اس ادبی ایڈونچر میں انھوں نے تاریخ کو کھنگالا، روایت کو پھرولا، تہذیبوں کے کھنڈرات اور معدومیت کو آواز دی، اساطیر کے قلب میں بیٹھ کر گم گشتہ جنتوں کی طرف نگاہ کی اور اس دوران تواریخی تسلسل اور ارتقائی عمل سے اپنا تعلق کمزور نہ پڑنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم" آگ کا دریا" کو اردو ادب کا عظیم ناول قرار دیتے ہیں، جس کا مرکزی کردار گوتم نیلمبر وقت کی اسی ارتقائی لہر کی علامت ہے۔ میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم، آخر شب کے ہم سفر، سیتا ہرن اور کار جہاں دراز ہے، ان دو درجن ادبی تصانیف کا حصہ ہیں جنھیں قرۃ العین کے قلم نے عجب فنکاری سے تراشا اور نکھارا۔ کولونیل عہد، ایلیٹ کلاس، سماجی تبدیلیاں، اینگلو انڈین رومانویت اور اس کے بین بین چلتی شدید اداسی، انقلاب زمانہ اور گہرا تاریخی شعور ان کی تحریروں کا خاص وصف تھا۔ بقول رضا علی عابدی "قرۃ العین جب تک سارا ہوم ورک مکمل نہیں کرلیتیں کہانی نہیں لکھتیں۔ اپنے عمر بھر کے مشاہدے اور مطالعے کو اپنی تحریر میں اس طرح برتتی ہیں کہ ان کی کوئی بات ذہن کی اختراع نہیں لگتی، ان کی کہانی کے سارے مقام بھی دیکھے بھالے ہیں، یوں بے تکان بیان کیے جاتی ہیں جیسے ہم سے توقع ہو کہ ہم بھی وہیں کے ہیں۔" مقام کے بعد زبان کی بات آتی ہے۔ انھوں نے کہانی کہنے کے ہر نئے ڈھنگ کو ایک ایسی زبان میں خوب سے خوب تر کیا ہے جو روایت کے معاملے میں بڑی تہی دست ہوا کرتی تھی۔ اجنبی نام اور دور دور کے مقام ان کی تحریروں میں بے تکان آتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اتنے اجنبی کہ کاتب کا قلم ڈگمگاتا ہے۔" "کار جہاں دراز ہے" میں ایک جگہ لکھتی ہیں: "القصہ عزیزو! اب وقت سحر وقت مناجات ہے۔ دنیا آنی جانی ہے۔ یہ کاغذات لپیٹ کر واپس طاق میں رکھ دو۔ اب طغرۂ شاہی اور مہر قاضی، خادم شرع جمیل، رسول الثقلین کے بجائے اعلام پیپر کا زمانہ آیا چاہتا ہے جو دور کلکتے کے چھاپے خانوں میں چھپنے شروع ہوگئے ہیں۔" نہٹور، لاکڑی اور محمود پور کے متعلق داستانی انداز میں" کار جہاں دراز ہے" کی تین جلدیں لکھنے والی اردو زبان کی ورجینا وولف نے اپنے ناولوں میں جو کردار تخلیق کیے، وہ اس قدر زندہ، متحرک اور جاندار تھے کہ قاری انھیں زمانی ارتقا میں اپنے اردگرد باقاعدہ سانس لیتے اور

چلتے پھرتے محسوس کرتا تھا۔ ان کی بنائی ہوئی فضا میں اس قدر رومانویت، اداسی اور پراسراریت ہوتی تھی کہ مہوے کی جھاڑیاں، بوڑھی پلکھن، دربار عظام، مولسری اور کولونیل عہد کے پھوس کے بنگلے وغیرہ وغیرہ پڑھنے والے کے لیے خاص الخاص چیز بن جاتے تھے۔ وہ تمام اشیا جن کے قریب سے عام انسان دیکھے اور کچھ محسوس کیے بغیر گزر جاتا ہے، قرۃ العین کے عالم محسوسات کا اہم جزو تھیں۔ مشاہدے اور مطالعے کے علاوہ اشیا کی ماہیت پر غور و فکر، زمانے کی تبدیلیوں کا طبعی اور غیر طبعی جائزہ اور گمشدہ زمانوں کی کھوج ان کے تخلیقی مزاج کی آسودگی، وسعت اور گہرائی کا باعث تھی! انھوں نے جس عہد میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں پرورش پائی اس نے ان کے اندر بیٹھی مضطرب، بے چین اور جستجو کی ماری تخلیق کارہ کی فکر کو Enrich کیا اور اس کے قلب کو مختلف النوع دکھوں سے آشنا کیا۔ زمانوں کے دکھ، انسانوں کے دکھ اور زمینوں کے دکھ۔۔۔ برٹش ماحول، امپیریلسٹ، کلچر، فیوڈل ازم اور ٹوٹتی بنتی اقدار کے درمیان فنا و بقا کی حقیقت، انسان کا ازلی المیہ، اور ابدی بے بسی، ''زندگی کیوں؟ موت کیوں؟ اور بے پایاں کائنات اور لامتناہی ازل اور ابد کے درمیان حیات انسانی کا حباب آسا موہوم وقفہ۔۔۔ باسٹھ تریسٹھ برس، یا اس سے بھی کم یا اس سے چند سال زیادہ۔۔۔ اور یہ سب تعلیم و تربیت، جدوجہد، تفکرات، تجربے، غم و اندوہ، ناکامیاں، مسرتیں اور اچانک فنا، یعنی دنیا کے بازار میں تہی دست آئے اور تہی دست گئے۔ اک مکمل لاتعنیت۔۔۔ ایک پوری لاحاصلی۔۔۔ جس کا نقشہ سامنے پھیلائے وہ جینوئن ادیبہ ہمیں نظر آتی ہے، جو اکیس اگست کے دھند لکے میں دہلی کے ایک معمولی فلیٹ میں زندگی کے آخری ایام گزار کر اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔ جس نے کبھی کہا تھا، ''ہمیں کیا معلوم کون کیسی مطمئن یا ملول زندگی گزار کر گیا ہے۔ یہ صرف وہی جان سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں۔''

امرتا پریتم نے اپنے آپ کو تڑ کے گھڑے کا پانی کہا تھا اور قرۃ العین حیدر خود کو گمشدہ زمانوں کی کھوجی کہتی تھیں اور ان گمشدہ زمانوں کی کھوج جن کا سفر سب سے پہلے ان کے اندر شروع ہوا، بعد میں اس کی بے چینی باہر آئی، تو رنگارنگ تخلیقات نہیں نوادرات کے ڈھیر لگ گئے۔ سبھی ایک سے بڑھ کر ایک، کسے انسان سراہے اور کسے نہ سراہے۔ درحقیقت اردو ادب میں خصوصاً ناول نگاری کے شعبے میں انھوں نے جو تجربے کیے اور اس صنف کو اپنی تحریروں، علمی و سیاسی شعور اور قلم کے معجزات سے جس قدر مالا مال کیا یہاں ان کے علاوہ اور کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ خصوصاً کولونیل عہد اور بدلتے ہوئے تہذیبی اور معاشرتی رجحانات کو ماضی کے پس منظر کو سامنے رکھ کر جس خوبی سے انھوں نے پینٹ کیا یہ انھی کا حصہ ہے۔ آج ان کی رحلت پر یہ سطور لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں، دہلی سے ایک اور رشتہ ٹوٹ گیا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے قرۃ العین حیدر سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا مگر یہ بھی ایک سچ ہے کہ مجھے اس کی زیادہ ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ میرے پاس گردش رنگ چمن، شیشے کا گھر، آگ کا دریا، کار جہاں دراز ہے اور آخر شب کے ہمسفر جیسی زندہ تخلیقات موجود تھیں۔ جو مجھے رومانویت پسندی، اداسی اور حقیقی مسرت کے مفہوم سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔ اسی لیے میں سمجھتی ہوں ایک سچے قلم کار کا اپنے قاری کے ساتھ جذباتی اور روحانی تعلق ہوتا ہے، جسے میل ملاقات سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، یہ ضمنی معاملات ہوتے ہیں، جن کا حقیقی معاملات سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں قرۃ العین حیدر کی وفات پر زیادہ اداس نہیں۔ نہٹور کی حویلیوں، محمود پور کی گلیوں اور لاکھڑی کی شہ نشینوں سے نکل کر نوئیڈا کے فلیٹ میں سادہ اور الگ تھلگ زندگی گزارنے والی اس عہد کی عظیم رائٹر کی وفات موت کا دھوکہ ہے۔ فنا کا سلسلہ ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ جب تک اردو زبان کو سمجھنے والوں کا ایک بھی قاری زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی کہ سچے لفظوں کو موت نہیں آتی، یہ تو محض گردش روز و شب ہے۔ حیات و ممات کے اس پرانے کھیل میں جسم کی موت ایک وہم کی طرح ہے۔ بقا ان روحوں کا حصہ ہے جو اردگرد پھیلی ناآسودگی، محرومیت، جبر اور بے بسی کو خون دل سے وقت کے پنوں پر رقم کرتی رہیں، سچ پہنتی رہیں، سچ اوڑھتی رہیں اور گردش رنگ چمن کا حصہ کہلاتی رہیں اور کہتی رہیں ''اجل کے ایک سو ہاتھ ہیں اور وہ ایک ہزار راستوں پر چلتی ہے وہ سب کی نظروں کے سامنے آسکتی ہے یا چپکے سے آکر نکل جاتی ہے، وہ سرگوشی کرتی آتی ہے انسان رات کو چراغ لے کر چلتا ہے لیکن نالے میں ڈوب جاتا ہے۔ دن دہاڑے زینہ چڑھتا ہے اور ایک شکستہ سیڑھی پر سے اس کا پاؤں رپٹ جاتا ہے، کھانا کھانے بیٹھتا ہے اور۔۔۔ خدا جانے جب اجل نے عینی آپا کے دروازے سے اندر جھانکا وہ اس وقت کیا کر رہی تھیں؟۔۔۔ باب العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا تھا ''جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم پر عیاں کردوں، تمھارا دل دہل جائے گا، باؤلے ہو جاؤ گے'':

اے حیرت تم کو ہوش ہے کیا
کس بھول کو اوڑھے سوتی ہوا

□□□

نکہت پروین (رپورتاژ)

ناقابل فراموش چار دن

26 اکتوبر 2007 وقت ڈھائی بجے شب، ڈیڑھ درجن افراد پر مشتمل ایک کارواں دہلی کے اندرا گاندھی ایئرپورٹ پر جمع ہو چکا ہے۔ سفر کا مقصد ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی اور منی پور کی ادبی و ثقافتی انجمنوں کے اشتراک سے منعقد ہونے والے سہ روزہ سیمینار میں شرکت کرنا۔ منزل ہے ہندوستان کے شمال مشرق میں واقع صوبے منی پور کی راجدھانی امپھال۔ موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ کچھ تو شب بیداری اور کچھ منی پور میں اردو سیمینار کا انعقاد، دونوں کیفیات کا اظہار چہرے مہرے، چال ڈھال غرض ایک ایک انداز سے ہورہا ہے۔ کارواں میں شامل ہر شخص کسی نہ کسی طور اس بات کو لے کر تشویش میں مبتلا ہے کہ ہندوستان کا ایک ایسا صوبہ جہاں کا رہن سہن، زبان اور جغرافیائی حدود اردو کے روایتی مرکز سے بہت دور ہیں۔ ایسے میں وہاں اردو کا سہ روزہ سیمینار کیسے چل پائے گا۔ آپ کہیں گے اور آپ سنیں گے کی طرز پر یہ سیمینار ہوگا اور دلی جو کہ نہ صرف ہندوستان کا مرکز ہے بلکہ اردو کا بھی مرکز ہے وہاں سیمیناروں میں سامعین کے لیے ترس جاتے ہیں تو منی پور میں کیا حال ہوگا۔ مایوس کن صورت حال سے دوچار ہونے کی قیاس آرائیاں بلکہ پیشین گوئیاں جاری ہیں۔ غرض اس طرح کے خدشات و خیالات لیے ساڑھے تین گھنٹے کا سفر کٹا لیکن امپھال ایئرپورٹ پر قدم پڑتے ہی تمام اندیشے لایعنی اور تمام قیاس آرائیاں وہم ثابت ہوئیں۔ ایسا پرخلوص اور پرجوش استقبال کہ سب حیران بلکہ بوکھلائے ہوئے ہیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ پذیرائی اس طرح ہوگی اور خوشگوار حیرتوں کا یہ سلسلہ منی پور میں داخل ہونے سے لے کر واپسی کے وقت کے آخری لمحے تک محیط رہا۔ امپھال ایئرپورٹ پر استقبالیہ کمیٹی کے اراکین ڈائرکٹر قومی کونسل ڈاکٹر علی جاوید کی سربراہی میں دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہیں۔ رتبے کے زعم میں اکڑی ہوئی گردنیں دیکھنے کے عادی لوگ عجز و انکسار کی صورتیں دیکھ رہے ہیں۔ منی پور میں صرف مطلع ہی صاف نہیں ہے بلکہ لوگوں کے چہرے بھی خلوص و انکسار سے درخشاں نظر آرہے ہیں، رتبے اور عہدے کے گھمنڈ سے دور تمام لوگ سرتاپا خلوص ہیں۔ چند ہی لمحوں میں دل میں پلنے والے وہم اور وسوسے ہی غائب نہیں ہوئے بلکہ ان کے بشاش چہرے دیکھ کر سفر کی تھکان بھی کافور ہوگئی۔ کھلی کھلی دھوپ، آئینے کی طرح صاف شفاف دل اور دلکش مسکراہٹوں نے مل کر ایک اپنائیت کی فضا بنادی۔

استقبالیہ کمیٹی کے ہمراہ یہ قافلہ قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھہرنے کا انتظام ہوٹل امپھال میں کیا گیا ہے۔ یہ سفید رنگ کی خوبصورت عمارت ہے۔ عمارت کے سامنے حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا پہاڑوں کا سلسلہ منظر کو پراسرار بنا رہا ہے۔ پرفضا مقام، ہوٹل کا وسیع لان اور گہرے بھید کی طرح دھند میں لپٹا کہستانی سلسلہ جس پر نظر پڑتے ہی دل میں بے اختیار پربتوں کے پار کی دنیا دیکھنے کی خواہش پیدا ہو۔ اس منظر کو نہارتے ہوئے سب لوگ تازہ دم ہونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ناشتے سے فارغ ہوکر کارواں منزل مقصود یعنی سیمینار ہال کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن اب بھی یہ بات کسی کے خواب و خیال تک میں نہ تھی کہ تھوڑی دیر بعد ہی اس خطے کے لوگوں کے ادبی ذوق کے تعلق سے ہم سب کے خیالات میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہونے والی ہے لیکن ''ایم آر ہینگنٹ ہال امپھال، میں قدم رکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ محبان اردو اور عاشقانِ میر نے یہاں بھی بستیاں آباد کررکھی ہیں۔

امپھال ایئرپورٹ پر پرجوش استقبال کے بعد ایک بار پھر پرکشش چہرے معصوم آنکھیں اور مناسب قدوقامت والے لوگ مقامی لباس پہنے سیمینار ہال میں شرکا کا پرجوش استقبال کررہے ہیں۔ مہمان خصوصی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل (شعبۂ تعلیم) محترمہ پورن دیشوری ہیں۔ مہمان خصوصی نے اپنی تقریر سے وہ سماں باندھا کہ سامعین انگشت بدنداں ہیں۔

جنوبی ہند کی ادبی روایات کی نمائندہ اپنی معلومات اور علم دوستی کا سکہ جما رہی ہے۔ سب ہمہ تن گوش بلکہ دم بخود، صرف ایک آواز نے تمام سامعین کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیا۔ یہ دلکش آواز بڑی روانی اور اعتماد کے ساتھ علمی حوالوں اور لسانی تاریخ کے تناظر میں اردو ادب میں گنگا جمنی تہذیب کے رنگ تلاش کررہی ہے اور ان رنگوں کو ہی اپنی شناخت، اور مستقبل میں ملک کی ترقی کا ضامن بھی بتا رہی ہے۔ ساتھ ہی اس اندیشے کا اظہار بھی ہے کہ اپنی اس میراث سے چشم پوشی عظیم قومی سرمائے کو تلف کردینے کے مترادف ہے لہٰذا ہمیں یہ قومی خسارہ نہیں کرنا ہے۔ محترمہ اردو سے اپنے دیرینہ روابط کا صرف تذکرہ ہی نہیں کررہی ہیں بلکہ اپنے اندازِ تکلم سے اس کے ثبوت بھی پیش کررہی ہیں۔ تقریباً 15 منٹ کی تقریر میں وزیر موصوف نے موضوعِ گفتگو میر اور اردو ادب کو ہی بنائے رکھا کوئی سیاسی وعدے نہیں۔ اردو کی فلاح کے لیے اعلانات

کرنے کے بجائے ادبی خزینوں سے مارکسزم اور نیشنلزم کے خواب کی تعبیریں تلاش کرنے کی صلاح دے رہی ہیں۔ غرض اپنے ادبی ذوق اور انداز گفتار سے انھوں نے سامعین کو اپنا گرویدہ بنالیا اور افتتاحی اجلاس میں وہ سماں باندھا کہ اس کے آثار سیمینار کے آخری لمحے تک رہے۔

مہمان خصوصی کی تقریر کے بعد منی پور کے وزیر تعلیم ایل. جینت کمار سنگھ نے سیمینار کا باضابطہ افتتاح فرمایا اور شرکا کا پر جوش خیر مقدم کرتے ہوئے جدوجہد آزادی میں اردو کے اہم کردار کا ذکر کیا۔ نیز اس بات پر بھی خوشی اور طمانیت کا اظہار کیا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور منی پور کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے باہمی اشتراک وتعاون سے منی پور میں قومی سطح پر کسی سیمینار کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ اردو زبان کی شیرینی اور منی پور کی ثقافت کے دھنک رنگوں کا یہ امتزاج ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیبی روایات کی توسیع ہے۔ انھوں نے ڈائرکٹر قومی کونسل ڈاکٹر علی جاوید کو اس اقدام کے لیے مبارکباد دی اور سیمینار کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اس سیمینار کے روح رواں منی پور کے سابق وزیر ثقافت تارا سنگھ نے منی پور کی تعلیمی اور ثقافتی انجمنوں کی جانب سے شرکا کا خیر مقدم کیا۔ افتتاحی اجلاس کے آخر میں ڈائرکٹر قومی کونسل ڈاکٹر علی جاوید نے اردو زبان کے روایتی مراکز سے دور اس سیمینار کے انعقاد میں درپیش رہے دشوار گزار مراحل کا ذکر کیا۔ یقیناً یہ ان کا ایک جرأت مندانہ فیصلہ تھا کیونکہ میر فہمی کے لیے امپھال جیسی جگہ پر سیمینار منعقد کرنے کے راستے میں دوچار سے زیادہ سخت مقام آئے ہوں گے لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے جذبۂ شوق ہر مشکل سے ابھر کر گوہر مراد پاتا ہے۔ انھوں نے بھی استقلال کا غیر معمولی مظاہرہ کرتے ہوئے بظاہر ناممکن کام کو نہ صرف ممکن کر دکھایا بلکہ یہ ایک تاریخ ساز قدم بھی ثابت ہوا۔ اس طرح کے فیصلے لینے کے لیے غیر معمولی جرأت اور خود اعتمادی ضروری ہے کیونکہ ایسے موقعوں پر عموماً ہمنوا لہجے مخالف آوازوں میں دب جاتے ہیں بہرحال یہ کام نہ صرف انجام کو پہنچا بلکہ ایک کامیاب تجربہ بھی رہا، اس لحاظ سے کہ یہ سب نے مانا کہ اردو کے فروغ کی کوششیں روایتی اردو مراکز سے ہٹ کر کرنا زیادہ سودمند ہے۔ سیمینار کے تعلق سے تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میر کی شاعری ہماری تہذیبی اور انسانی قدروں کی نقیب ہے لہٰذا اس کے ہر پہلو تک رسائی کرنا ہم سب کا ادبی فریضہ ہے اور یہ سیمینار اس جانب پیش رفت ہے۔ افتتاحی اجلاس کی شاندار تقریب میں ہی آئندہ اجلاسوں کی کامیابی کی جھلک نظر آرہی تھی اور شرکا کے چہروں پر طمانیت کے آثار تھے۔

اب مقالات پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شمیم حنفی نے فرمائی اور نظامت ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے۔ سب سے پہلے پروفیسر قمر رئیس نے اپنا مقالہ ''میر وادیِ عشق سے آگے'' کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے میر کی شاعری کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جہاں میر عشق کی روایتی شعری سطح سے بلند نظر آتے ہیں انھوں نے میر کی معاصرانہ حسیت اور ادراک پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ میر کے یہاں مشاہدات اور فکر ونظر کا دائرہ وسیع ہے۔ فرحت رضوی نے ''میر کی غزلوں میں موسیقیت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے میر کی غزلوں میں غنائیت اور آہنگ کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ میر کی غزلوں کو گایا جانا چاہیے۔ اس کے ذریعے میر کی رسائی غیر اردو داں طبقے تک بھی ہوگی۔ بہار سرکار کے سابق وزیر اقلیتی فلاح و بہبود اور پی ڈبلیو ڈی، پروفیسر لطف الرحمٰن نے ''میر تقی میر اور ولی دشت بیاضی'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور ''شعر العجم'' میں شبلی کے بیان کردہ اس خیال کو اپنے مقالے کی بنیاد بنایا کہ میر کا کلام اردو میں انھی خصوصیات کا حامل ہے جو خصوصیات فارسی شاعر ولی دشت بیاضی کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے ولی دشت بیاضی اور میر کی مماثلتوں کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا۔ اس کے بعد مقالات پر سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا مقامی لوگوں نے نہ صرف یہ کہ توجہ سے مقالے سنے بلکہ سوال وجواب کے سیشن کے دوران جس جوش وخروش کا مظاہرہ کیا وہ حیرت انگیز اور قابل تعریف تھا۔ یہ لوگ زبان کی حدود کو درکنار کرتے ہوئے بلا جھجک اپنے تاثرات ظاہر کر رہے تھے۔ آخر میں پروفیسر شمیم حنفی نے بہ حیثیت صدر تمام مقالوں پر اپنی مجموعی رائے ظاہر کی۔ اس اجلاس کے خاتمے پر کھانے کے وقفے کے دوران ایک بار پھر منی پوری لوگوں کی میزبانی اور خلوص کا نظارہ عام تھا۔ اس خلوص نے لذیذ کھانے کو لذیذ تر بنا دیا۔ لنچ کے بعد سب سیمینار ہال میں آبیٹھے۔ یہ سیمینار اس اعتبار سے بھی اپنی نوعیت کا انوکھا سیمینار تھا کہ اس میں لنچ سے پہلے اور لنچ کے بعد شرکا کی تعداد گھٹتی بڑھتی نہیں تھی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سراج اجملی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے ''میر کی لفظیات میں فارسی، عربی، دیسی الفاظ اور محاوروں کے کامیاب امتزاج کا تجربہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے میر کے یہاں سادہ، سلیس، اور آسان زبان کے استعمال کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر سہیل فاروقی نے میر کی لفظیات کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میر نے جس انداز سے زبان کو برتا ہے وہ ان کا امتیازی وصف ہے۔ الفاظ میر کے یہاں اظہار کی غیر معمولی قوت حاصل کر جاتے ہیں۔ میر کی مخصوص لفظیات کے حوالے سے انھوں نے اپنے دعوے کو مدلل کیا۔

پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں دو عہد ساز شعرا

میر اور غالب کی عظمت اور مقبولیت کا ذکر کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میر نے کس طرح اپنے بعد آنے والے دور کو متاثر کیا اور یہ کہ میر اور غالب کی تخلیقی قوت کے جوہر پوری اردو شاعری پر اثر انداز ہیں۔

دوسرے اجلاس کے اختتام تک محفل یوں ہی سجی رہی۔ اس شام کو یادگار بنانے کے لیے سیمینار کے "سوتر دھار" اسٹیج پر آئے۔ ارے یہ تو منی پور حکومت کے سابق وزیر ثقافت نارا سنگھ ہیں۔ نارا سنگھ کی انتظامی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں اور ان کا حسن انتظام قابل ستائش، کلچر کے نشے میں خود بھی سرشار ہیں اور دوسروں کو اپنے لطف میں شامل کرنے کے رمز سے آشنا ہیں۔ انھوں نے سیمینار ہال کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے منی پور کی سیر کرائی۔ ان کی یہ صلاحیتیں غیر معمولی اور حیرت انگیز ہیں۔ ان صفات کی بنیاد پر ڈائرکٹر قومی کونسل نے موصوف کو ڈیجر مین کا خطاب دے دیا۔

ادب اور آرٹ لسانی اور جغرافیائی حدود کو پار کرتے ہوئے اپنی بستیاں آباد کر لیتے ہیں، ان خیالات کا اظہار نارا سنگھ نے افتتاحی اجلاس میں کیا تھا اور آخری دن تک اپنے اس قول کی عملی تصویر بنے رہے۔ خاکساری اور انکساری کا مرقع یہ شخص جہاں حیرت کے در وا کرنے کے بعد نہایت معصومیت سے ایک طرف کھڑا ہو جاتا یہ اس کی مخصوص ادا تھی گویا ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر آگے بڑھنا ان کا مخصوص انداز تھا۔

نارا سنگھ کے اسٹیج پر آنے کے بعد ناظرین کے لیے خوشگوار حیرتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ڈیجر مین قدم قدم پر کرشمے دکھاتا تھا۔ اپنی ذات میں انجمن اس شخص نے دلوں کی دھڑکن کو بھی اپنی گرفت میں کر لیا تھا۔ زندگی کے ایک ایک پل سے مسرت کشید کرنا اس کا ہنر ہے۔ اس ہنر کی بدولت تمام شرکا نے بھی ہر لمحے کا لطف اٹھایا۔ نارا سنگھ کے اس ہنر، جوش، جذبے اور انتظامی صلاحیتوں کو تمام شرکا کا سلام۔

مقالات کے اجلاس کے خاتمے کے بعد میدان نارا سنگھ کے ہاتھ ہوتا تھا اور وہ اپنی زنبیل سے کسی جادوگر کی مانند لطف اور سرور نکال کر سامعین کے درمیان جو کچھ تقسیم کرتے تھے وہ ادب، ثقافت اور سیاست کا انوکھا امتزاج ہوتا تھا۔ کبھی میر کی شاعری پر گفتگو، کبھی علاقائی رقص و موسیقی کے نظارے، کبھی مارشل آرٹ کے حیرت انگیز کرتب، ناظرین سانس روکے اسٹیج پر کوندتی ہوئی بجلیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے اس قول کی تجدید نظر آتی ہے کہ گیت سنگیت کی جھنکار زبان کے وسیلے کے بغیر بھی اظہار کی بے کنار قوتیں سمیٹے ہے۔ یہ قوت کانوں کے ذریعے دل و دماغ اور پھر پورے وجود کو مسخر کر لیتی ہے۔ ایک ایسا جہاں تعمیر کرتی ہے جہاں نہ دیس نہ پردیس نہ رنگ نہ نسل نہ مذہب نہ ذات کوئی قید نہیں ہر طرف لطف ہی لطف سرور ہی سرور۔ یہ سرور یہاں بھی اعلیٰ انسانی اقدار کے پیروکاروں پر سرمستی کا عالم طاری کر رہا ہے اور امن کے ان پیغامبروں کے چہروں کی چمک گھنے اندھیروں کے سینے چاک کر رہی ہے۔ اخوت، امن، آشتی کی بقا پر ایقان کو مضبوط تر کرتے یہ فنکار اور ان کا فن آفریں صد آفریں سیمینار کا پہلا دن ہر اعتبار سے کامیاب اور یادگار رہا۔

امپھال میں سورج نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات بھی مرکزی ہندوستان کے باسیوں کے لیے ایک انوکھا تجربہ ہیں۔ امپھال میں سورج جلدی درشن دیتا ہے۔ لہٰذا وہاں تمام لوگ آداب سحر خیزی کو ملحوظ رکھے ہوئے تھے۔ سورج کا سنہرا تھال ہر سو زرافشانی کرتے ہوئے پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوتا۔ دہلی کے آلودہ ماحول کے عادی لوگوں کے لیے چمکیلی صبح کا نظارہ قدرت کا انعام ہے۔ جھلمل جھلمل تاروں بھری راتیں، جگمگاتی صبح، یہ جگ مگ یہ دمک مناظر تک ہی محدود نہیں بلکہ یہاں کے لوگوں کے مزاج کا بھی خاصہ ہے۔ روپہلی دھوپ کی نرم شعاعیں پیغام زندگی دیتی ہوئی نمودار ہوتی ہیں۔ سیمینار کا دوسرا دن میر فہمی کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عقیل رضوی نے کی اور نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر فضل امام مخمور سعیدی، پروفیسر ش۔اختر، ڈاکٹر شاہد پرویز، پروفیسر شہاب ملک، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر نکہت پروین کے نام ہیں۔ فضل امام نے "زبان میر پر فارسی کے اثرات" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ میر کی زبان پر فارسی اثرات کس حد تک ہیں۔ مخمور سعیدی نے اپنے مقالے میں میر کی شاعری کی خصوصیات بیان کیں اور کہا کہ میر کی شاعری ان کے اس شعر کی صحیح مصداق ہے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ڈاکٹر شاہد پرویز نے "میر کے چند امتیازات" کے عنوان سے میر کے کلام کی ان خصوصیات کی جانب اشارہ کیا جو انھیں خدائے سخن کے مرتبے پر فائز کرتی ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے "کلام میر کے سیاسی حوالے" کے عنوان سے پرچہ پڑھا اور کلام میر کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی جن کے ذریعے میر نے اپنے عہد کے سیاسی انتشار و ادبار کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر ارجمند آرا نے "میر کی شاعری میں احساس اور جذبے کی عمل داری" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ میر نے اپنے تجربے اور احساس کا اظہار زبان کی روح کو اپنے اندر سمو کر کیا ہے۔ نیز ان کی شاعری کسی مربوط فلسفۂ حیات سے زیادہ احساس و ادراک کا بیان ہے۔ نکہت پروین نے اپنے مقالے "کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ" کے تحت میر کی شاعری کے نشاطیہ پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ میر کی شاعری محض رنج وغم کا بیان نہیں بلکہ اس میں زندگی کی دیگر کیفیات کا بیان بھی شامل ہے۔ آخر میں پروفیسر عقیل رضوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کچھ بحث طلب نکات کی وضاحت کی۔ مقامی حضرات نے پوری توجہ اور انہماک سے مقالوں کو سنا اور اپنے تاثرات ظاہر کیے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت الہٰ آباد یونیورسٹی سے تشریف لائے پروفیسر راجندر کمار نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر ظہورالدین نے ''میر کے کلام میں پیکریت'' کے عنوان سے بات کی اور میر کے اشعار میں پیکر تراشی کی مثالیں بھی پیش کیں۔ ابوبکر عباد نے ''میر کی شاعری میں جنسی پیکر'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا اور میر کی شاعری کے اس پہلو کو اجاگر کیا جو انھیں متحرک جذبے اور خیال کا شاعر بناتا ہے۔ کولکاتا یونیورسٹی سے آئی ڈاکٹر شہناز نبی نے ''شاعر آہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور آہ اور واہ کے تنقیدی محاورے کو اساس بناتے ہوئے اپنی بات کہی۔ اس اجلاس کے اختتام پر تمام شرکا کو گورنر منی پور ڈاکٹر ایس. ایس. سدھو کی دعوت پر راج بھون جانا تھا۔ منی پور میں غروب آفتاب کے اوقات بھی مختلف ہیں۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے ہیں، پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ان کی چہچہاہٹ کسی دلکش نغمے کی سی تاثیر لیے ہوئے ہے۔

امپھال کا راج بھون ایک سادہ مگر پرشکوہ عمارت ہے۔ سلیقے سے آراستہ کشادہ لان، لیچی کے چھتنار درخت، ہوا میں شامل پھولوں کی مہک، دور افق پر ڈوبتے سورج کے دلفریب رنگ، اس خوشگوار ماحول اور خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تمام لوگ راج بھون کے وسیع وعریض ہال کی طرف گامزن ہیں۔ ہال کی آرائش بہت سادہ مگر نفیس ذوق کی علامت ہے۔ خوب صورت پینٹنگس، قومی رہنماؤں کے پورٹریٹ، قرینے سے لگی ہوئی نشستیں ابھی سب ہال کا جائزہ ہی لے رہے ہیں کہ سادگی و انکسار کا نمونہ ڈاکٹر ایس. ایس. سدھو ہال میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے انھیں فرداً فرداً ہر ایک سے متعارف کرایا۔ گورنر امپھال نے اپنی گفتگو اردو شعروادب کے حوالے سے شروع کی اور میر کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے منی پور میں اردو کے فروغ کے لیے چند تجاویز گورنر صاحب کے گوش گزار کیں جن میں اسکولی سطح پر اردو کی درس و تدریس کا اہتمام اور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ گورنر صاحب نے ان تجاویز پر غور کرنے کی یقین دہانی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی اس بات کے خواہاں ہیں۔ چائے کے پرتکلف دور کے دوران بھی انھوں نے اردو مراکز کو زیادہ فعال بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ گورنر صاحب سے گفت وشنید کے بعد منی پور میں اردو کے فروغ کے امکانات روشن ہوئے۔ امید کی کرن لیے تمام لوگ سیمینار ہال کی طرف واپس آگئے۔ کیونکہ ناراسنگھو کو حیرت کرنے کے لیے پختہ انتظام کیے بیٹھے ہیں۔ پہلے دن فن کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کے بعد ہر آنکھ آج کا جلوہ دیکھنے کی متمنائی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیمینار ہال میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے وہ رنگ بکھرے کہ ماحول گلنار ہو گیا۔ جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ان نظاروں پر خواب کا گمان گزرتا تھا۔ اندر دیوتا کی سبھا کی شوخیاں، رعنائیاں روح کے پار اتر جانے والی سریلی آوازیں، رقص کے ہوشربا نظارے سب نے مل کر وہ سماں باندھا کہ باید وشاید، ہر نظر حیران ہر دل فرحاں، سیمینار ہال جلوہ گاہ ناز میں تبدیل ہو گیا۔ جتنا ان فنکاروں کے فن کو دیکھتے تھے مزید دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ بہرحال وقت کے تقاضوں کے پیش نظر رنگ ونور کا سیلاب رکا تو لیکن اس کے سحر سے باہر آنا آسان نہیں تھا۔ رقص وموسیقی کی اس شاندار پیشکش کی خاص بات یہ تھی کہ نسوانی کردار بھی لڑکے نبھا رہے تھے اور اپنے فن میں اتنے طاق تھے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا'' 28 اکتوبر سیمینار کا آخری دن۔ صبح پھر سب تازہ دم ہو کر سیمینار ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ مقامی لوگوں کے جوش وخروش اور سیمینار میں ان کی عملی شرکت کی خواہش کے پیش نظر تیسرے دن کا نصف آخر مقامی لوگوں کے لیے مختص کر دیا گیا اور پہلے اجلاس میں پروفیسر سید عقیل رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر احمد محفوظ، پروفیسر راجندر کمار، پروفیسر انیس اشفاق اور ڈاکٹر سراج اجملی نے اپنے مقالے پیش کیے اور نظامت ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے کی۔ عقیل رضوی نے ''میر کی مثنوی اور عام انسانی زندگی کے چند کردار'' کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع مقالہ پیش کرتے ہوئے میر کی مثنویوں میں کردار نگاری کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''میر کا ایک ناقد علی سردار جعفری'' کے موضوع پر اپنا پرچہ پڑھا اور کہا کہ میر کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے سردار جعفری نے اپنے نظریاتی مسلک سے چشم پوشی اختیار کی اور غیر جانب دارانہ رویہ اپنایا۔ انیس اشفاق نے ''میر کی میر کشی'' کے عنوان کے تحت ان رویوں کی جانب اشارے کیے جو میر کے تخلیقی عمل کا خاصہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میر کے اپنے لکھے نے ہی میر کی شاعری کی کچھ جہات کو پوشیدہ کر دیا ہے۔ پروفیسر راجندر کمار نے ''میر کی شاعری کا اڑوس پڑوس'' کے عنوان سے عہد میر کے دیگر شعرا اور دیگر زبانوں کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے جہان میر کو دیکھا۔ احمد محفوظ نے اپنے مقالے ''میر آب حیات کے حوالے سے'' میں ان نکات کی جانب اشارے کیے جن کی بنا پر آب حیات میر فہمی کی بنیاد اور اہم ماخذ ہے۔ سراج اجملی نے اپنے مقالے ''عشق حقیقی اور میر کی غزل'' میں ان کیفیات کا ذکر کیا جو میر کے یہاں عشق کی ارفع

سطح متعین کرتی ہیں۔ میر کے یہاں عشق کا عالم پر چھا جانے والا جذبہ ہے۔ سیمینار کے آخری اجلاس کے اختتام پر صدر نشین پروفیسر انیس اشفاق نے مقالات کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مقالوں کے تعلق سے کچھ تاثرات اور سوالات بھی سامنے آئے۔ مقالہ نگار حضرات نے جواب کی صورت میں اپنے زاویۂ نظر کی مزید وضاحت کی۔ دوسرا اجلاس مقامی لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس سیشن میں انھوں نے اپنے خیالات و تاثرات بیان کیے۔ زیادہ تر لوگ اردو درس و تدریس کے مواقع اور مراکز سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

تیسرا اجلاس، اراکین مجلس انتظامیہ اور ڈائرکٹر قومی کونسل اسٹیج پر تشریف فرما ہیں اور منی پور کے ثقافتی قصر کے ایک اہم ستون، شاعر، ادیب، ڈراما نگار، اداکار، رتن تھیام بڑی شستہ اردو میں تقریر کر رہے ہیں۔ اردو زبان کی سادگی، لوچ، دلکشی جیسی صفات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس زبان سے اپنے جذباتی رشتوں کا ذکر بھی بڑی وارفتگی سے کر رہے ہیں۔ پرکشش شخصیت، چہرے پر متانت اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک لیے پر اعتماد لہجے میں ڈرامے کے فن اور روایت پر روشنی ڈال رہے ہیں نیز اردو ڈرامے کی روایت کے ارتقائی سفر پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی معلومات افزا گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کچھ ایسے جملے کہے جنھیں سن کر حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور تمام ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔

اب اظہار تشکر کے لیے ڈاکٹر علی جاوید مائک پر تشریف لے آئے ہیں اور یقیناً یہ شکریہ رسمی نہیں ہے۔ وہ حسن انتظام سے لے کر میزبانی، خلوص، انکسار اور تعاون ایک ایک بات کے لیے شکر گزار ہیں۔ انھوں نے اپنے توصیفی کلمات میں یہ بھی کہا کہ اس پرجوش خیر مقدم اور حوصلہ افزائی اور تعاون کے بعد منی پور میں اردو کے فروغ کے لیے راہیں ہموار ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ تمام شرکا کے دلی جذبات کی ترجمانی بھی کر رہے ہیں۔ وہ ڈیجر مین کی صلاحیتوں کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

یہ ڈیجر مین ایک بار پھر اسٹیج پر حاضر ہے۔ ان کے اسٹیج پر آتے ہی نگاہیں پردہ اٹھنے کی منتظر ہو جاتی ہیں۔ امیدوں کے عین مطابق اس خطرناک جادوگر نے ایک ڈرامے کے ذریعے امن عالم، انسان دوستی اور بھائی چارے کا پیغام اس انداز سے دیا کہ یہ ڈراما منی پوری زبان میں ہونے کے باوجود سب نے سمجھا۔ فنکاروں کی بہترین اداکاری نے زبان کی خلیج کو پاٹ دیا اور امن کے ابدی پیغام کے ساتھ یہ سہ روزہ سیمینار اختتام کو پہنچا۔

ہر کوئی منی پور کے لوگوں کی مہمان نوازی اور ادبی ذوق کا قائل ہو چکا تھا۔

منی پور میں قیام کا ایک روز باقی تھا اور نار اسنگھ اس دن کو بھی یادگار بنانے کے لیے لائحہ عمل تیار کیے علی الصبح ہوٹل میں حاضر تھے۔ سب سے پہلے امپھال سے تقریباً 45 کلومیٹر کی دوری پر واقع قصبہ موئرانگ جانے کا پروگرام ہے۔ اس قصبے کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ یہاں 14 اپریل 1944 کو پہلی مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کا پرچم نیتاجی سبھاش چندر بوس کی سربراہی میں لہرایا گیا تھا۔ امپھال سے موئرانگ تک کا سفر بہت دلچسپ تھا۔ سورج کی سنہری کرنوں سے نہا کر نکھرے ہوئے نظارے، حد نظر تک پھیلا پہاڑی سلسلہ، بلندی کے ساتھ عمق کا احساس بھی سمیٹے ہوئے تھا۔ کام میں مصروف لوگ، اسکول جاتے بچے، غرض زندگی ہر ہر گام پر لہکتی، مچلتی، چونچال کرتی، رواں دواں نظر آ رہی ہے۔ شمال مشرق کے تعلق سے خوف و ہراس پیدا کرنے والی اخباری سرخیوں کا کہیں شائبہ نہیں۔ ہر منظر جیو اور جینے دو کی تشہیر کرتا نظر آیا۔ سیمینار ہال میں منی پور کی ثقافت کے جلوے عام تھے۔ امپھال سے موئرانگ تک کے سفر میں عام زندگی قدم قدم پر نظروں سے معانقہ کر رہی ہے۔ دھان کے کھیتوں میں کام کرتی عورتیں، ضروریات کا سامان فروخت کرتے دکان دار، امنگ بھرے دل اور پرجوش قدموں سے کالج جاتی نوجوان نسل، معصوم اداؤں کے جلوے بکھیرتے ہندوستان کا مستقبل بچے، یہ یقیناً اس ہندوستان کی تصویر تھی جس کا خواب آنکھوں میں بسائے سبھاش چندر بوس نے موئرانگ میں پرچم کشائی کی تھی۔ غرض زندگی کے مثبت پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے یہ سفر کٹا اور سب موئرانگ کے آئی۔این۔اے۔ میوزیم پہنچ چکے ہیں۔ اس میوزیم میں سبھاش چندر بوس کی زندگی سے متعلق بہت سی یادگاریں محفوظ ہیں۔ ان کی تحریر کا عکس، خطوط، تصاویر، وردی، بلّے، اسلحہ اور نہ جانے کتنی چیزیں۔ اس میوزیم کو دیکھنے کے بعد حب وطن سے سرشار جیالوں کے لیے دل میں عقیدت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور ان کی عظیم قربانیوں کے لیے شکر گزاری کے، اس میوزیم میں ایک یادگاری نشان بھی ہے جس کا سنگِ بنیاد اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے 1959 میں رکھا۔ اس پر رومن رسم الخط میں اردو کے یہ الفاظ کندہ ہیں۔ اتفاق، اعتماد، قربانیاں الفاظ کو پڑھ کر سفیران اردو کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر علی جاوید نے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور ان لمحات کو یادگار قرار دیتے ہوئے جنگ آزادی میں اردو صحافت اور اردو زبان کے اہم رول کا بھی ذکر کیا۔

سب موئرانگ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع لوک ٹاک لیک کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ جھیل شمال مشرق علاقے میں تازہ پانی کا سب سے بڑا منبع ہے۔ ذرا دیر میں قافلہ اس جزیرے پر پہنچ گیا۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے حسین دلکش مناظر نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ پہاڑ کے دامن میں پھیلی ہوئی صاف و شفاف نیلے پانی کی جھیل، جھیل کی نیلگوں سطح پر تیرتے سرسبز و شاداب کنول، مرغابیوں کے جھنڈ،

جھیل میں مچھلیاں پالنے کا بندوبست اور حد بندی کے لیے پتوں سے بنائے گئے سبز دائرے، نیچے نیلے پانی کی سطح، سر پر کھلا نیلا آکاش، یہ نظارے فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہر کوئی ان مناظر کو تصویروں میں قید کرنے کا خواہاں ہے۔ ہر زاویے سے تصویر کشی کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے ایسا جی چاہتا تھا کہ یہیں سارا وقت گزارا جائے۔ بہر حال وقت کی پابندی مدِ نظر تھی ہر کوئی مزید دیکھنے کی خواہش دل میں لیے یہاں سے رخصت ہوا۔

اب منزل دوسری جنگ عظیم کی وہ یادگار ہے جو جاپانی شہیدوں کی یاد میں بنوائی گئی ہے۔ یہ جگہ امپھال سے تقریباً 16 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ جنگ کے دوران بہنے والے سپاہیوں کے خون کی لالی نے اس پہاڑی کو ریڈ ہل کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔ جنگ عظیم کے ہولناک سائے اب بھی اس یادگار کی دیواروں پر لہراتے ہوئے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اتنے کم وقت میں اتنی جگہوں کی سیر کا پروگرام بنا کر نارا سنگھ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ ٹائم مینجمنٹ کے ہنر میں بھی طاق ہیں۔ سیر کے بعد سب ہوٹل پہنچے اور لنچ کے بعد شاپنگ کا پروگرام بنا اور امپھال کی ایما مارکیٹ کا رخ کیا۔ یہ مارکیٹ اپنی طرز کا ایک انوکھا بازار ہے۔ تین ہزار سے زائد خواتین اس بازار کو چلاتی ہیں۔ اسے مدر مارکیٹ بھی کہتے ہیں کیونکہ مقامی زبان میں ''ایما'' ماں کو کہتے ہیں۔ صوبائی معیشت میں عورتوں کی اتنی بڑی حصے داری اور سماجی زندگی میں مرد کے برابر حقوق منی پوری عوام کی روشن خیالی کے ثبوت ہیں۔ اس بازار میں روزمرّہ کی ضروریات کے سامان سے لے کر منی پوری گھریلو دستکاری کے نمونے تک دستیاب ہیں۔

سورج غروب ہو رہا ہے۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے ہیں۔ سب کو ہوٹل واپس جانے کی جلدی ہے کیونکہ رتن تھیام نے سیمینار کے تمام شرکا کو اپنی آرٹ گیلری میں مدعو کیا ہے۔ وہ اپنے نفیس اور شگفتہ اندازِ گفتگو سے سب کو اپنا گرویدہ بنا چکے ہیں۔ ان کی آرٹ گیلری میں پر تکلف ضیافت اس شام کو یادگار بنا گئی۔

رتن تھیام کی آرٹ گیلری کی کشادہ عمارت اڑنے کے لیے پر تولتے کسی پرندے کی مانند مائل بہ پرواز نظر آتی ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں بے اختیار آسمانوں کی سیر کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

وسیع باغ میں درختوں کی قطاریں صاحب خانہ کے فطری حسن سے لگاؤ کی غماز ہیں۔ نفاست سے تراشی گئی روشیں دعوت سیر چمن دے رہی ہیں۔ فضا میں شامل پھولوں کی مہک مشام جاں کو معطر کر رہی ہے۔ جنون کی حد تک پہنچی آرٹ سے دل چسپی اس عمارت کے گوشے گوشے سے عیاں ہے۔ میزبان کی رہبری میں تمام لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔ سب ایک سائبان کے نیچے جا کر ٹھہر گئے۔ رتن تھیام اپنے مہمانوں سے مخاطب ہیں۔ نہایت خلوص سے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور متین لہجے میں اپنے یہاں تک کے سفر کی کچھ یادوں میں اپنے مہمانوں کو بھی شامل کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی خوش ذائقہ چائے کا دور بھی چل رہا ہے گردو پیش کا ماحول اور رتن تھیام کے لہجے کی تاثیر سب ہمہ تن گوش ہیں۔ ایک آواز سب کی توجہ کا مرکز ہے۔ رتن تھیام کے خاموش ہونے پر یہ سحر ٹوٹا اور سب نے عمارت کی سیر کی۔ پوری عمارت برقی قمقموں سے بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ سر پر تنی آسمان کی نیلی چادر پر جھلملاتے تاروں کا جال ایک فسوں تھا جو ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ چلتے چلتے سب عمارت کے اس حصے تک پہنچے جہاں رتن تھیام کے گروپ کے ذریعے اسٹیج کیے گئے ڈراموں کے ٹائٹل اور تصاویر آویزاں ہیں۔ اس عمارت میں ایک کشادہ تھیٹر بھی ہے جس کا اسٹیج دلی کے کمی آڈیٹوریم سے بھی بڑا ہے۔ یہاں سے سب عمارت کے اس حصے کی طرف آئے جہاں ضیافت کا اہتمام ہے۔ منی پوری کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو فضا میں بسی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ مل کر لذت کام و دہن کی آزمائش کے لیے تیار ہے۔ مقامی انداز کا کھانا ہے اور کھانا کھانے کا بندوبست بھی مقامی طرز پر کیا گیا ہے۔ چٹائی پر قطار سے سب لوگ بیٹھ گئے اور خوش رنگ اور خوش ذائقہ کھانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ تمام اشیا پتوں سے بنے ہوئے برتنوں میں رکھی گئی تھیں۔ دھلے منجھے پیتل کے گلاس جن سے پانی پی کر پیاس اور بھڑک رہی تھی اور جی چاہتا تھا اس مہکار اس سگندھ کو پانی کے راستے کشید کر کے دل و جان میں اتار لیا جائے۔ وقت کو قید کر لینے کی خواہش دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ دلوں کو مسخر کرنے کا ہنر کوئی رتن تھیام جی سے سیکھے۔ اس ضیافت نے سیمینار کی خوشگوار یادوں میں چار چاند لگا دیے۔

سہ روزہ سیمینار اور ایک یادگار دن پر محیط یہ قیام اپنے اختتام کو پہنچا اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے۔ بنگال، بہار، سکم، منی پور، دلی، اتر پردیش غرض ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے تمام شرکا کا سیمینار میں یکساں دل چسپی لینا بڑی بات ہے۔

30 اکتوبر کی صبح دہلی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ بچھڑنے کا وقت قریب تھا۔ تمام منتظمین ہوٹل میں جمع ہیں اور اب ان کے چہروں پر افسردگی کے آثار ہیں۔ ہر ملاقات کی طرح اس ملاقات کا انجام بھی جدائی ہے۔ لیکن رخصت ہوتے وقت ناقابلِ فراموش یادوں کا سرمایہ بھی ساتھ ہے پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر ہاتھ ہلاتے چہرے نگاہوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ سب دلوں میں گھر بنا چکے ہیں یقیناً ایسی ہی ملاقاتوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ''عمر بھر ایک ملاقات چلی آئی ہے۔''

□□□

Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi-7

وسیم اختر

اقبال مجید سے بات چیت

اقبال مجید کا شمار عہد حاضر کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی فکری وفنی بصیرت کے سبب جدید افسانہ نگاروں میں اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ افسانے کے علاوہ انھوں نے ڈرامہ، ناول اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی اپنی تخلیقی کاوش کے جوہر دکھائے ہیں۔ ساتھ ہی ہدایت کار کی حیثیت سے بھی معروف ہیں ۔ لیکن اقبال مجید کی شناخت اردو ادب میں افسانوی ادب کے حوالے سے ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز اس دور میں ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور اکثر وبیشتر فنکار اس تحریک کے زیر اثر ادب تخلیق کر رہے تھے۔ لہٰذا اقبال مجید ابتدا میں سماجی حقیقت نگاری کے قائل تھے جس کی بھرپور عکاسی ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بعد کے زمانے میں انھوں نے یہ روش ترک کردی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ادب میں داخل ہونے والے ہر نئے رجحان کو اپنے زمانے اور ادب کا تقاضہ سمجھ کر قبول کیا۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے ''دو بھیگے ہوئے لوگ''، ''ایک حلفیہ بیان''، ''شہر بدنصیب'' اور ''تماش گھر'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے فکر وفن کے مختلف پہلوؤں کو قارئین تک پہنچانے کے مقصد سے میں نے براہ راست ان سے ملاقات کی۔ ان سے بات چیت کا اہم حصہ پیش ہے۔

سوال: آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے ہوا؟

جواب: میری ادبی زندگی کا آغاز افسانہ سے ہوا۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' 1955 میں لکھا۔ اس وقت میں طالب علم تھا۔

سوال: پہلا افسانہ جس سے آپ کو خاص پہچان ملی؟

جواب: ''عذرو چچا'' جو ''شاہراہ'' دہلی میں چھپا۔ ان دنوں اس کے ایڈیٹر ظ۔ انصاری تھے۔

سوال: آپ نے ناول افسانہ اور ڈرامہ تینوں ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اپنے تخلیقی وسیلۂ اظہار کے طرح ان میں سے کس صنف کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں؟

جواب: اس بات کا تعین موضوع کرتا ہے کہ وہ افسانے میں پناہ لے گا تو زیادہ صحت مند ہوگا یا ناول کے کینوس میں ڈھلے گا تو زیادہ صحت مند ہوگا۔ میری سمجھ میں افسانہ، ناول یا ڈرامہ ساری اصناف اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور ان کا اپنا اپنا ایک رول ہے۔

سوال: وہ کون سے درپیش مسائل ہیں جو آپ کو چیلنج کرتے ہیں۔ مثلاً فرقہ پرستی، دہشت گردی وغیرہ؟

جواب: ہر عہد اور ہر زمانہ اپنے مسائل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور کشمکش سے گذرتا ہے۔ مصنف اپنے زمانے کے سارے مسائل سے پنجہ لڑاتا ہے، اپنے خیالات کے ساتھ ان سے الجھتا ہے، ان میں جیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ مسئلے کو وہ اس حل کی طرف لے جائے جس پر اس کا اپنا یقین واعتماد ہے۔ وہ چاہے کوئی حل نہ بتائے لیکن اشارہ ضرور کرتا ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی تخلیقی عمل کا پہلا کام ہے کہ وہ فکر کے دریچے کھولے۔

سوال: آپ ترقی پسند تحریک کے پیرو ہیں یا اس کے نظریات کی محض حمایت کرتے ہیں؟

جواب: ہم نے جس زمانے میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اور ہمارا حلقہ بھی اس تحریک سے وابستہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی وفکری طور پر ہم نے ادب کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا وہ درست تھا۔ ادب کو انسانی قدروں سے جوڑنا بہت ضروری ہے اور جو سماجی حالات ہیں انھیں ایک صحیح سمت دینے کے لیے ادب کی رہنمائی لازمی ہے۔ ہم نے ترقی پسند تحریک کو ایک نئے ادبی رجحان کے طور پر قبول کیا کسی سیاسی تنظیم کے طور پر نہیں۔

سوال: گویا آپ تحریک کا حصہ نہیں بنے؟

جواب: نہیں۔ بالکل نہیں۔

سوال: قاری، ادیب سے کیا چاہتا ہے؟ کیا قاری اور ادیب ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کسی بھی ادبی تخلیق میں قاری برابر کا شریک ہوتا ہے۔ ادیب کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہوتی ہے اور قاری کو اپنی رائے دینے کی آزادی حاصل ہے قاری کو کسی ادیب کی تحریر کو رد کرنے کی پوری چھوٹ ہوتی ہے۔ اسی طرح ادیب کو بحیثیت مصنف یہ حق حاصل ہے کہ وہ قاری سے کہے کہ جو تم پسند کر رہے ہو وہ میں نہیں

لکھوں گا یا میں نہیں لکھ سکتا۔ بصورت دیگر دونوں پر جبر ہوگا۔ اگر کوئی قاری لکھنے والے پر جبر کر رہا ہے جیسے حکومتیں کرتی ہیں کہ آپ نہیں لکھ سکتے تو یہ میرے لیے ناقابل قبول ہے۔

سوال: آپ نے علامتی افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ اس نوعیت کے افسانوں میں علامتوں کا استعمال کس ضرورت کے پیش نظر کیا ہے؟

جواب: میں نے اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال موضوع کو طاقت دینے کے لئے ایک ٹول (Tool) کی طرح کیا ہے۔ تا کہ اس کا اچھا لنک (Link) ہو سکے، اس میں دھار پیدا ہو سکے۔

سوال: جب علامتی رجحان عام ہوا تو اردو افسانے میں ''کہانی پن'' کی بحث چھڑی۔ عہد حاضر میں ایک بار پھر افسانہ نگار کہانی پن کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک افسانے میں ''کہانی پن'' کی اہمیت کیا ہے؟

جواب: جس طرح سے ایک شیروانی ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں شیروانی، کوٹ ہوتا ہے تو کوٹ، ان دونوں کی اپنی اپنی پہچان ہے ہم کوٹ کو شیروانی اور شیروانی کو کوٹ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح افسانے کی بھی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے دوسری تحریر سے الگ کرتی ہیں۔

سوال: کیا آپ یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ بیانیہ اور علامتی میں کون سی طرز تخلیقی وسیلۂ اظہار کے لیے زیادہ مناسب ہے، جس سے افسانے میں کہانی پن برقرار رہے؟

جواب: اس میں کسی بندھے ٹکے اصول کو نہیں اپنایا جاسکتا ہے۔ بلکہ ادیب بندھے ٹکے اصولوں کو توڑتا ہے اور نئی زمین، نئے راستے ہموار کرتا ہے۔ اور دکھاتا ہے کہ ''دیکھو اس طرح سے بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔'' کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جو افسانے کو کسی اخبار کی رپورٹ یا کسی ڈرامے کے منظر سے الگ کرتی ہیں۔ میری نظر میں بیانیہ فن میں ترقی تو ہوگی لیکن کچھ حدود کے اندر رہ کر ہی ممکن ہے۔ جیسے کہ مالی پودوں کو تراش خراش کر جو بھی شکل بناتا ہے اس سے اصل پودے کی شناخت ختم نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ پودوں کو کاٹ چھانٹ کر بطخ یا طوطا بنا دیا گیا ہے لیکن جن پودوں پر یہ اشکال بنائے گئے ہیں وہ تو وہی ہیں۔ جہاں تک افسانے کی بات ہے تو مجھے یہ نہیں لگتا کہ بیانیہ اور علامت ایک دوسرے کے مخالف ہیں بلکہ افسانے کے لیے یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک اچھے افسانے میں ہم اچھا بیان بھی پاتے ہیں اور علامتی طرز بھی دیکھتے ہیں۔

سوال: جدیدیت سے آپ کس حد تک متاثر ہیں؟

جواب: میں نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی ضد کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ رجحان اپنے پیش رو رجحانات کے مقابلے میں کن کن Areas یا علاقوں میں تازہ دم اور Relevent ہے اور ادب کو جس نئے Value System کی روشنی میں آنک رہا ہے وہ ہماری ادبی روایت کو صحت مند طور پر آگے بڑھانے میں کہاں تک مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ میں جدیدیت سے صرف اس حد تک متاثر ہوا جس حد تک وہ ہمارے تہذیبی ورثے اور سماجی حقیقتوں کا احترام کرنے کی حالت میں رہی اور ہماری فکشن کی روایت جس کی غالب صفت حقیقت نگاری تھی، دوست بن کر نہ سہی اس کی حریف بن کر بھی نہیں کھڑی ہوئی۔

سوال: اس رجحان نے اردو افسانے کو کس طرح متاثر کیا؟

جواب: اس رجحان کے مثبت اور منفی دونوں اثرات اردو افسانے پر پڑے ہیں۔ مثبت اثرات تو نمایاں طور پر موضوعات کے انتخاب میں دیکھے جاسکتے ہیں جہاں انسان کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامتی پیرایۂ اظہار کو تخلیقی طور پر برتنے کی شعوری کوشش یہاں واضح طور پر نظر آتی ہے، تجریدیت کو فروغ دیا گیا، زبان کو چست بنایا گیا، فرد اور اس کی آزادی کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وجودیت کی فکر کو نئے ادب میں پہنچنے کی راہ ملی اور انسان کی لاچاری کے بنیادی پہلو نمایاں کیے گئے۔ اس تحریک کے مضر پہلو یہ ہیں کہ اس نے ادب کی نشاط انگیزی اور سرشاری چھین لی۔ ایسا لگنے لگا کہ سارے افسانے صرف دو تین لوگ مختلف ناموں سے لکھ رہے ہیں۔ جس آزادیٔ اظہار کا اس تحریک نے پرچم اٹھایا تھا وہ ایک طرح کی یک رنگی اور Monotony میں بدل گئی۔ افسانے کی صنف ایک اکتا دینے والی شے بن کر بالآخر اپنے قارئین سے بالکل ہی کٹ کر رہ گئی یہاں تک افسانوی ادب قاری کے لیے نہیں صرف چند لکھنے والوں کے لیے وقف ہو کر رہ گیا۔ وہی پڑھتے اور وہی سمجھتے تھے۔

سوال: پچھلے پچاس برسوں میں اردو افسانے میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں؟

جواب: افسانے کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ خارجیت کے ساتھ داخلیت پر توجہ دی گئی اور دروں بینی کی کوششیں ہوئی، ذات کے کرب اور اس کے المیے کو افسانے کا موضوع بنایا گیا۔ اسلوب،

تکنیک، زبان علامتی اور تجریدی پیرایۂ اظہار میں تجربے کیے گئے۔ زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیتے ہوئے اختصار سے کام لیا گیا، زبان کے استعمال میں سکہ بند اور کلاسیکی روئیے کے بجائے توڑ پھوڑ ہوئی۔ اس کے ساتھ کچھ منفی اثرات بھی آئے، مغربی ادب سے ادھار لیے ہوئے مسائل جیسے فرد کی تنہائی اور وجودی افکار کی بدہضمی کے نمونے بھی دیکھنے کو ملے۔ کیونکہ اردو میں آنے والے ادبی رجحانات اکثر دیر تک رہتے ہیں۔ اس لیے ہندی افسانے کے مقابلے میں اردو فکشن میں یہ Hang Over کافی دیر تک قائم رہا۔ ان پچاس برسوں میں کم سے کم 25 برس اندھا دھند تجربوں میں گزرے، دس برس اس کے Hang Over میں پچھلے پندرہ ہیں برسوں سے بدن کی ٹوٹن، انگڑائیاں لے کر دور کی جا رہی ہے۔

سوال: آپ خود اپنے افسانوں میں فکر وفن اور موضوعات کی سطح پر کوئی بڑی تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

جواب: وہ تو ہے۔ افسانہ لکھتے ہوئے تیس پینتیس سال ہو گئے، تو تبدیلی تو ہوئی ہے۔ اب وہ تبدیلی کتنی ہے، خوشگوار ہے کہ ناخوشگوار ہے اس کا اندازہ تو ہمارے پڑھنے والے ہی صحیح لگا سکتے ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے بھی اور فنی طور پر بھی تبدیلی آئی ہے۔ نئے نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش کی ہے۔

سوال: آپ اپنے معاصرین میں خود کو کسی کے قریب پاتے ہیں یا کسی افسانہ نگار سے متاثر ہیں؟

جواب: میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کے اثرات قبول کیے مگر میرے یہاں کسی کا مخصوص رنگ نہیں ملے گا۔

سوال: ان کے نام؟

جواب: بیدی، منٹو تو بہت خاص لوگ تھے۔ بعد میں جب میں گریجویشن کر رہا تھا تو قرۃ العین حیدر اور لکھنؤ کے بہت سے افسانہ نگار مثلاً حیات اللہ انصاری اور پرانے لوگوں میں علی عباس حسینی سے متاثر ہوا۔ پاکستان کے افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین وغیرہ بہت اچھے لگے۔

سوال: موجودہ دور میں اردو افسانے کی سمت کیا ہے؟

جواب: موجودہ افسانے نے خود کو جدیدیت کے اوڑھے ہوئے تصورات سے باہر نکالا ہے اور اپنا رشتہ براہ راست اپنے قرب وجوار کی زندگی اور اس کے مسائل سے جوڑا ہے۔ وہ بیانیہ جو جدیدیت نے نکال پھینکا تھا اس کی واپسی ہو رہی ہے اور گنجلک علامت نگاری جو فیشن کے طور پر اپنائی گئی تھی اس سے پیچھا چھڑا لیا گیا ہے۔ مگر اس نئی تبدیلی کو نئی راہ متعین کرنے کے لیے ترقی پسندی کی مثبت قدر یعنی نئے عہد کے انسان کے دردمند شعور سے گہری وابستگی کو ایمانداری سے قبول کرنا ہے اور جدیدیت سے زبان اور اسلوب کی تازگی لے کر علامت کے چیستان استعمال کے بجائے فکری نشاط انگیزی کے حصول کے لیے سلیقے سے اور تخلیقی طور پر اس کو برتنے کا مشکل اور صبر آزما کام نئے افسانہ نگاروں سے ہنوز متوقع ہے۔

سوال: تقسیم ہند سے اردو زبان پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

جواب: تقسیم کے بہت برس بعد تک اردو پر یہ الزام رہا کہ اس نے ملک کو تقسیم کروایا ہے۔ جس کی اردو کو کافی سزا ملی۔ ہندوستان میں اردو کا وقار ہی نہیں گرا بلکہ اس کے ماضی کے بہترین کارناموں اور جنگ آزادی کے لیے کی گئی خدمات کو بھی بھلا دیا گیا۔ پچھلے چند برسوں میں اردو کی جانب سے پرانے شکوے کم ہوئے ہیں اور اس کی زبردست پسپائی کے بعد اردو کی بحالی کے لیے کچھ مثبت اقدام بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔

سوال: اردو زبان وادب کے فروغ میں مختلف سرکاری اداروں کے کردار سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: جہاں تک صوبائی یا مرکزی سرکاری ایجنسیوں کی کارگزاریوں کا سوال ہے تو ان کے مقاصد، دائرۂ عمل، سرکاری مصلحتیں، محدود وسائل پھر سربراہوں کے کام کرنے کے طریقے ان کی علمی و ادبی لیاقت اور جذبۂ خدمت ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے ان اداروں کی کارگزاریوں کی سطحیں بھی مختلف ہوتی ہیں لیکن ان کی کارکردگی اور سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے ساتھ یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ غیر سرکاری ایجنسیاں ان کاموں کی انجام دہی میں کس حد تک معروف ہیں یعنی غیر سرکاری انفرادی اور اجتماعی پروگراموں اور سرگرمیوں کے بغیر اس زخم خوردہ زبان کے زخموں کا اندمال ممکن نہیں ہے اور صورت حال کا یہی پہلو ابھی بھی مایوس کن ہے۔

□□□

پتہ:
Room No. 243,
Jhelum Hostel,
JNU, New Delhi-110067

بھرت جھن جھن والا

ڈرگ کمپنیاں پھیلا رہی ہیں خطرناک ٹی. بی.

ہندوستان میں مریضوں کی اموات کا سب سے بڑا سبب ٹی۔بی ہے۔ ماضی میں اس بیماری کا دوداؤں سے علاج کیا جاتا تھا۔ مریض کو بارہ ماہ تک دوا دی جاتی تھی۔ پایا گیا کہ کئی مریض اس علاج کو مکمل نہیں کرتے تھے۔ نتیجتاً ٹی۔بی کا بیکٹیریا پوری طرح نہیں مرتا تھا اور مریض دوبارہ مرض کی گرفت میں آجاتا تھا۔ جس طرح چور جیل میں بند رہنے کی مدت میں خاموش ہوجاتا ہے لیکن باہر نکلنے پر اس کی فطرت دوبارہ ظاہر ہوجاتی ہے اس طرح ٹی۔بی بیکٹیریا علاج کے دوران سست پڑ جاتا ہے لیکن علاج بند ہوتے ہی دوبارہ ظاہر ہوجاتا ہے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے امریکی سرکار، اقوام متحدہ کی ''ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن'' اور حکومت ہند نے مل کر حکمت عملی تیار کی۔ مریض کو دو دواؤں کی بجائے چار دوائیں دی گئیں۔ علاج کی مدت بارہ ماہ سے گھٹ کر چھ ماہ رہ گئی۔ سوچا گیا کہ مدت کم ہونے سے علاج مکمل کرنے کا امکان بڑھ جائے گا اور زیادہ تعداد میں مریض شفایاب ہوں گے۔ ایسا ہوا بھی۔ انڈین جرنل آف ٹیوبرکلوسس، میں شری ایس بھٹ بتاتے ہیں کہ دو دواؤں کے پرانے علاج میں صرف تیس سے چالیس فیصدی مریضوں کا علاج ہو پاتا تھا جبکہ نئے علاج میں اسّی فیصدی کامیابی مل رہی تھی۔

اس تجزیے کی بنیاد پر سرکار نے نئے منصوبے کا آغاز کیا۔ مریضوں کو چار دواؤں کا علاج دیا گیا۔ 2003 میں ڈبلیو ایچ او اور حکومت ہند کے مشترکہ سروے میں پایا گیا کہ نئے پروگرام میں یومیہ 2500 مریضوں کا علاج شروع کیا جارہا ہے اور 500 جانیں بچائی جارہی ہیں۔ اس کامیابی کے باوجود ٹی۔بی کا مریض ملک میں بڑھتا جارہا ہے۔ انتہائی مشکل سے ٹھیک ہونے والی ''ڈرگ ریسسٹنٹ ٹی۔بی'' تقریباً آٹھ فیصدی مریضوں میں پھیل چکی ہے۔ ہندوجا نیشنل اسپتال، ممبئی کی ایک تحقیق میں پایا گیا کہ بڑی تعداد میں مریضوں کے علاج مکمل نہ کرنے کے سبب یہ مرض ''ڈرگ ریسسٹنٹ'' ہوجاتا ہے۔ یعنی اس پر دوا اثر نہیں کرتی۔ تحقیق میں پایا گیا کہ 1300 ٹی۔بی کے مریضوں میں 32 فیصدی میں مرض نے ''ڈرگ ریسسٹنٹ'' شکل اختیار کرلی تھی۔ ''ڈرگ ریسسٹنٹ'' ٹی۔بی کے مریضوں کی اوسط عمر محض 30 برس تھی۔

ہمارے سامنے عجیب وغریب صورت حال ہے۔ ایک طرف نئے پروگرام کے تحت روزانہ 500 جانیں بچائی جارہی ہیں، دوسری طرف نوجوانوں میں ٹی۔بی کا پھیلاؤ ہورہا ہے۔ ان دونوں باتوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ماضی میں دو دواؤں سے علاج کیا جاتا تھا۔ اس وقت 40 فیصدی مریضوں کا کامیاب علاج ہوتا تھا۔ باقی 60 فیصدی مریضوں میں مرض دوبارہ پہنچتا تھا۔ لیکن یہ مرض زیادہ پھیلتا نہیں تھا۔ پرانے پروگرام میں ٹی۔بی کا بیکٹیریا کمزور تھا۔ جن 60 مریضوں کا علاج مکمل نہیں ہوتا تھا ان سے دو چار صحت مند لوگوں میں مرض پھیلتا رہا ہوگا ایسا میرا اندازہ ہے۔

نئی چار دواؤں کے علاج سے 80 فیصدی مریض شفایاب ہوجاتے ہیں، لیکن جو 20 فیصدی مریض اپنا علاج مکمل نہیں کرتے ان میں یہ مرض جارحانہ ''ڈرگ ریسسٹنٹ'' کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ان 20 فیصدی مریضوں سے ''ڈرگ ریسسٹنٹ بیکٹیریا'' ٹی۔بی کا پھیلاؤ ہورہا ہے۔

پرانے اور نئے پروگرام کا موازنہ کرنے کے لیے دو چیزوں کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اول یہ کہ مرض سے براہ راست کتنے لوگ نجات حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ علاج مکمل نہ کرنے والوں کے ذریعے نئے لوگوں میں مرض کتنا پھیلتا ہے۔ مان لیجیے 1000 لوگوں کی آبادی والے گاؤں میں 100 ٹی۔بی کے مریض ہیں۔ پرانے پروگرام کے تحت 40 کا علاج ہوجاتا تھا۔ باقی 60 فیصدی مریض رہتے تھے۔ ان کے ذریعے مرض زیادہ نہیں پھیلتا تھا۔ مان لیجیے 900 صحت مند لوگوں میں 5 فیصدی کو یہ مرض گرفت میں لے لیتا تھا اور 45 نئے مریض بنتے تھے۔ آخری گنتی اس طرح تھی 100 مریضوں میں سے 40 کا کامیاب علاج ہوا باقی بچے 60 ان 60 میں سے 45 نئے لوگوں میں مرض پھیلا۔ آخر میں 105 لوگ مرض کا شکار ہوگئے۔ لیکن نئے پروگرام کے تحت 100 میں سے 80 مریضوں کا کامیاب علاج ہورہا ہے لیکن جن 20 مریضوں کا علاج مکمل نہیں ہوتا ہے۔ ان میں ڈرگ ریسسٹنٹ ٹی۔بی پیدا ہورہی ہے اور یہ بیکٹیریا بڑی تعداد میں نئے لوگوں میں پھیل کر انھیں مریض بنا رہے ہیں۔ مان لیجیے 900 صحت مند لوگوں میں 10 فیصدی مریض ہوگئے اس طرح 90 نئے مریض پیدا ہوگئے۔ آخری گنتی اس طرح بنتی ہے۔ 100 مریضوں میں سے 80 کا کامیاب علاج ہوا۔ باقی بچے 20، ان 20 سے 90 نئے مریض پیدا ہوگئے۔ آخر میں 110 افراد مرض کا شکار ہوگئے۔ وہ بھی ''ڈرگ ریسسٹنٹ'' بیکٹیریا سے۔ اس طرح دو کی بجائے چار دوائیں دینے سے ٹی۔بی کا مرض بڑھ رہا ہے۔

اس پروگرام کا فائدہ ڈرگ کمپنیوں کو ضرور مل رہا ہے۔ پہلے وہ دو دوائیں بیچتے تھے، اب چار دوائیں بیچتے ہیں۔ پہلے نئے مریضوں کا علاج دو دواؤں سے ہوجاتا تھا۔ اب نئے مریضوں میں ''ڈرگ ریسسٹنٹ بیکٹیریا'' ہونے سے انھیں اسپتال میں داخل کرا کر زیادہ سخت دوائیں دی جارہی ہیں۔ اس طرح وزارت صحت عوام کو بیمار بنا کر ڈرگ کمپنیوں کے بازار کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہے۔

ڈرگ کمپنیاں نئے پروگرام کی تشہیر کے وقت زور دے کر یہ بتاتی ہیں کہ پرانے پروگرام 40 فیصدی کامیاب علاج کے مقابلے میں نئے پروگرام میں 80 فیصدی کامیاب علاج ہورہا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن یہ لوگ یہ نہیں بتاتے ہیں کہ جن لوگوں کا مکمل علاج نہیں ہوتا ہے اور ان میں ''ڈرگ ریسسٹنٹ بیکٹیریا'' پیدا ہوتے ہیں ان کا باقی عوام پر کیا منفی اثر پڑتا ہے۔ اس طرح ڈرگ کمپنیاں عوام کو ''ڈرگ ریسسٹنٹ ٹی۔بی کی طرف ڈھکیلنے میں لگی ہوئی ہیں اور وزارت صحت ان کی پشت پر ہے۔

□□□

پتہ:
Lakshmoli, PO Maletha, Via Kirti Nagar,
Dt Tehri Garhwal, Uttaranchal - 249161

شیو پریہ دویدی

کیا ہے سیتو سمدرم پروجیکٹ؟

ماحول اور مقامی زندگی کو متاثر کرنے والا ایک مسئلہ کس طرح بنیادی سوالات سے ہٹ کر حکومت کی غفلت اور مخالف پارٹیوں کے متعصب تیوروں کی وجہ سے غیر ضروری مباحث اور اختلافات میں پھنس جاتا ہے اس کا تازہ ترین نمونہ ہے سیتو سمدرم پروجیکٹ۔

یہ پروجیکٹ دراصل ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحلی علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے سمندر کے بیچ سے 167 کلومیٹر لمبا سیدھا راستہ نکالنے کے متعلق ہے۔ اس پروجیکٹ میں ایک ایسی نہر نکالنے کی تجویز ہے۔ جو سری لنکا میں جافنا کے نزدیک سے گزرتے ہوئے خلیج منار اور آبنائے پاک کو جوڑے گی۔ چونکہ اس حصے میں پانی کی گہرائی محض ایک سے دس میٹر کے بیچ ہے اس لیے چھچھلے سمندری حصوں میں کھدائی کرکے مٹی ہٹائی جائے گی تاکہ جہازوں کی آمدورفت کے لیے ضروری گہرائی پیدا ہو سکے۔ نہر کے ذریعے بحیرۂ عرب خلیج بنگال سے جڑ جائے گا۔

سری لنکا میں منار اور ہندوستان میں رامیشورم کے بیچ چونا پتھر اور مونگے کی چٹانوں اور ریت کے ڈھیروں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ اسے آدم برج (Adam Bridge) بھی کہتے ہیں اور رام سیتو بھی کہا جاتا ہے۔ عام خیال ہے کہ سری لنکا تک رسائی کے لیے بھگوان رام نے اس پل (سیتو) کو تعمیر کرایا تھا، اس لیے ہندوؤں کے مذہبی جذبات اس سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ یہ چٹانیں آبنائے پاک اور خلیج منار کو الگ کرتی ہیں۔ اس حصے کی گہرائی کافی کم ہونے کی وجہ سے سمندری جہازوں کو ہندوستان کے مشرقی ساحلی علاقوں سے مغربی علاقوں تک آمدورفت کے لیے سری لنکا کا چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہے۔ یعنی ہندوستان کی جنوبی بندرگاہوں کو جوڑنے والا کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ اس منصوبے کے تحت ان چٹانوں کو تراش کر سمندر کی گہرائی میں اضافہ کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ چٹانوں کے اس سلسلے اور ریت کو رام سیتو ماننے والے اس پروجیکٹ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں عوام مذہب کو مانتے ہی نہیں بلکہ جیتے ہیں، اس طرح کی باتوں سے اشتعال پیدا ہوتا ہے اور بنیادی باتیں بے توجہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

پروجیکٹ کے حامیوں کے دلائل ہیں کہ اس راستے کی تعمیر سے مشرق سے مغرب کے ساحلی علاقوں تک جانے کے لیے جہازوں کو کم دوری طے کرنی پڑے گی۔ تقریباً 785 کلومیٹر اور 30 گھنٹوں کی بچت ہوگی۔ جہاز بغیر سری لنکا کا چکر لگائے کیرل سے تمل ناڈو جا سکیں گے۔ توتی کورن اور رامیشورم کو بڑی بندرگاہوں کے طور پر ترقی دی جا سکے گی۔ بیرونی ملکوں سے کاروبار میں اضافے کے ساتھ ساتھ سری لنکا اور تمل ناڈو میں لٹّے (LTTE) کی کارگزاریوں پر نظر رکھنا بھی آسان ہو جائے گا۔

ان تمام دلائل کے باوجود اس پروجیکٹ میں چند خامیاں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جذباتی انداز نظر اور سیاسی ہنگاموں کے درمیان گم ہو جانے والی ان دیگر خامیوں پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس پروجیکٹ سے سمندری جانوروں، سمندر کی ماحولیات اور مچھواروں کی روزی پر منفی اثرات پڑنے کے واضح امکانات ہیں۔ ملک کے بہت سے ماہرین ماحولیات نے اس پروجیکٹ سے پیدا ہونے والے خطروں سے آگاہ کیا ہے۔

خلیج منار قدرتی دولت سے پُر ملک کے حصوں میں سے ایک ہے۔ یہ ہندوستان کا سمندری ذخیرۂ حیات (Marine Bio-Sphere Reserve) ہے۔ اس حصے میں حیوانات و نباتات کی تقریباً 3600 قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ مونگے کی چٹانیں اور مینگرو و بھی کافی اہم سرمایہ ہیں۔ بہت سے نایاب سمندری حیوان پستانیہ، کچھوے، ڈالفن، وھیل وغیرہ بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ نئی نہر کے بننے اور بڑے پیمانے پر جہازوں کی آمدورفت کی وجہ سے پانی کے بہاؤ میں جو تبدیلی واقع ہوگی اس سے Inland Water Balance کے بگڑنے کا بھی خطرہ ہے۔ چٹانوں کی چھٹائی میں بہت سے چھوٹے جزیروں کو بھی نقصان پہنچے گا۔ مونگے کی چٹانوں کے نیست و نابود ہونے سے مچھلیوں اور دیگر سمندری جانوروں کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ چٹانیں مچھلیوں کے لیے اہم جائے تولد ہیں اور یہیں ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ گزرتا ہے۔ ان چٹانوں کو توڑنا ان معصوم جانوروں کو بے گھر کر دینا ہوگا۔ مونگے کی یہ چٹانیں مینگرو و کے درختوں کے ساتھ مل کر سمندری طوفانوں، سائکلون اور سونامی سے ساحلی علاقوں کا تحفظ کرتی ہیں۔ سونامی کے وقت ان کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی۔ خلیج بنگال یوں بھی سمندری طوفانوں کے نقطۂ نظر سے جلد متاثر ہونے والا حصہ ہے۔ وہاں کی ساحلی ماحولیات کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ مینگرو و کے درخت گلوبل وارمنگ سے دوچار دنیا کے لیے بہت اہم ہیں کیوں کہ یہ کافی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ کو جذب کر لیتے ہیں۔ دنیا بھر میں جس طرح مونگے کی چٹانوں اور مینگرو و کے جنگلوں کو نقصان پہنچ رہا ہے کیا سیتو سمدرم بھی اسی سمت میں بڑھتا ایک قدم ہے؟

سائنس دانوں کے مطابق اس نہر کا راستہ اس جگہ سے ہو کر گزرتا ہے جہاں سمندر کی تہہ میں ریت اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ ایسے میں یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ اتنی لاگت اور قدرتی دولت کی قیمت پر بننے والا یہ پروجیکٹ کہیں کل ریت کے ڈھیر میں دب کر نہ رہ جائے۔ غرض یہ کہ اس پروجیکٹ پر کام شروع کرنے سے پہلے ان تمام باتوں پر نظر رکھنا ضروری ہے اور اگر منفی اثرات مثبت پہلوؤں سے زیادہ ہیں تو اس کے بجائے دوسرے راستوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک حل یہ سامنے آیا ہے کہ رامیشورم اور دھنش کوٹی ریلوے کے بیچ منڈپم گاؤں کے پاس بالو کے ٹیلوں کو ہٹا کر بھی مشرق اور مغرب کے ساحلی علاقوں میں آمدورفت کے لیے راستہ نکالنا ممکن ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس قسم کے دوسرے راستوں کی بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک اہم پروجیکٹ ہے۔ مذہبی اور سیاسی ہنگاموں سے اسے نقصان پہنچانے کے بجائے اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور و فکر کرکے اس سمت میں قدم بڑھانا ملک کے لیے زیادہ سودمند ہوگا۔

□□□

Deptt. of Urdu, Allahabad University, Allahabad

فخر الدین وحید

ماحولیاتی حدّت اس صدی کا سب سے بڑا چیلنج

اقتصادی پیش رفت نے پوری دنیا میں کہرام برپا کر دیا ہے ہر ملک ترقی کی اس دوڑ میں آگے نکلنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ اس ترقیاتی مہم کے سبب فضا گرین ہاؤس گیسوں سے مسموم ہو چکی ہے اس کے ممکنہ اثرات اور دوررس نتائج کا احساس ہی اتنا بھیانک ہے کہ ماہرین ماحولیات اور اصحاب حل وعقد کی عقلیں سراسیمہ ہیں اس لیے کہ یہ دہشت گردی کے انسداد یا پولیو کی بیخ کنی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا حرارتی طوفان ہے جس کی لپیٹ میں تمام ممالک آئیں گے۔ ماحولیات کی یہ تبدیلی موجودہ بیماریوں کا رخ دوسرے محفوظ علاقوں کی طرف پھیر دے گی اور مزید نئی بیماریوں کو جنم دے گی۔ چنانچہ 250 ماہرین ماحولیات پر مشتمل ادارہ آئی پی سی سی نے اپنی حالیہ رپورٹ میں ان متوقع خطرات کی حیرت انگیز پیشین گوئی کی ہے۔

آئی پی سی سی رپورٹ کے مطابق سمندر کی سطح میں 1961 سے 1993 تک سالانہ 8-1 ملی میٹر کا اضافہ ہو رہا تھا لیکن 1993 سے 2003 کے دوران یہ اوسط تقریباً ڈبل ہو گیا اور سالانہ 3.1 ملی میٹر تک پہنچ گیا۔ اکیسویں صدی کے اختتام تک سمندری سطح 18 سے 59 سینٹی میٹر تک پہنچ سکتی ہے۔ نیز 10 سے 20 سینٹی میٹر کا اضافہ اور ممکن ہے اگر پولر آئس شیٹ کا پگھلنا برقرار رہا۔ محققین کا کہنا ہے کہ اگر پوری دنیا GHG کے اخراج کی محافظ بھی بن جائے تو موجودہ گیس کی سطح صدیوں اس حرارتی عمل کو جاری رکھے گی۔ اس صدی کے اختتام تک عالمی درجۂ حرارت ہر حال میں 1.1 ڈگری سیلسیس تک پہنچ جائے گا اور فضا میں مزید گیس کا اضافہ خطرناک سطح C6.4 تک پہنچ جائے گا جس کی وجہ سے سمندری سطح میں اضافہ، سخت گرمی، چہروں کو جھلس دینے والی ہوائیں، خشک سالی، سمندری طوفان، خطرناک بارش اور سونامی جیسے واقعات میں اضافہ ہوگا۔ جانور اور پودے بھی حد درجہ متاثر ہوں گے۔ ہمالیہ کے برفیلے تودے بہت تیزی سے پگھل رہے ہیں جن سے گنگا، مہاندی اور برہمپترا جیسی ندیاں نکلتی ہیں اور جن سے ہندوستانی زراعت اور صنعت وحرفت پھل پھول رہی ہے اگر یہ سلسلہ دراز ہوا تو مستقبل میں ان ضروریات کے لیے پانی کی فراہمی کے تشویشناک مسائل پیدا ہوں گے۔ بارش سے پیدا ہونے والی فصلوں پر گہرا اثر پڑے گا۔ چاول کی پیداوار 15.4 فیصد اور گیہوں 3.4 فیصد کم ہونے کا امکان ہے۔

یو این انوائرمنٹ پروگرام نے انڈیا کو ان ستائیس ملکوں میں شمار کیا ہے جو سمندری سطح کے اضافے سے غیر محفوظ ہیں ملک کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی سمندر کی صحت بخش فضا اور خوشگوار ماحول میں سانس لے رہی ہے۔ ممبئی، کلکتہ اور چنئی، ہندوستان کے تین عظیم صنعتی شہر سمندری نعمتوں میں پل رہے ہیں۔ ایشین ڈیولپمنٹ بینک اسٹڈی کے مطابق سمندری سطح میں ایک میٹر کا اضافہ ہندوستان میں 576,400 ہیکٹر زمین کو زیر آب کر دے گا۔ گویا اپنی 4.32 فیصد زمین کھو سکتا ہے اور اس کی وجہ سے تقریباً 7.1 ملین لوگ بے گھر ہو جائیں گے۔ دہلی کے انرجی رسورسز انسٹی ٹیوٹ کے مطابق اڑیسہ اور مغربی بنگال کے نچلے علاقے غرق ہو سکتے ہیں۔ اس اضافے کی وجہ سے کھاری پانی زمین کے میٹھے پانی میں مل سکتا ہے اور اسے ناقابل استعمال بنا سکتا ہے۔ اس کے ہندوستانی اقتصادیات پر بھی دوررس اثرات پڑیں گے۔ اگر حدّت 2.3 فیصد تک پہنچی تو کسان 25 فیصد کا نقصان اٹھا سکتے ہیں۔

GHG کی فضا میں کثرت کے سب سے بڑے مجرم ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ ترقی پذیر ممالک بھی اپنی روز افزوں ترقی کے سبب اس کے ذمے دار ہیں۔ ہندوستان میں کاربن ڈائی آکسائڈ کے متوازی گرین ہاؤس گیس کا اخراج 2020 تک تین ہزار ملین ٹن تک ہو جائے گا۔ جو عالمی GHG کا پانچ فیصد ہے۔ چین چند قدم آگے ہی ہے۔ گرین ہاؤس گیس کا اہم سبب اقتصادی ترقی ہے اس لیے جو ملک ترقی کی دوڑ میں جتنا آگے ہوگا، عالمی حدّت میں اس کا حصہ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اقتصادی ترقی پر لگام لگانا تقریباً ناممکن ہے لہٰذا GHG پر قابو پانا بھی مشکل ترین امر ہے اس لیے اب احتیاطی، حفاظتی اور متبادل وسائل کی تلاش ہے۔ IPCC کی رپورٹ آنے سے پہلے ہی کیلی فورنیا میں دو قانون سازوں نے تھامس ایڈیسن کے ایجاد کردہ بلب پر پابندی لگانے کی پیشکش کی اور ٹیوب بلب لگانے کی تجویز رکھی۔ کیونکہ CFL بلب 1300 پاؤنڈ کاربن ڈائی آکسائڈ کو کم کرنے لگا جو پاور پلانٹ کے ذریعے فضا میں چھوڑی جاتی ہے۔

اس عالمی حدّت میں اے سی (.A.C) اور مویشی بھی برابر کے شریک ہیں۔ ایرکنڈیشنرز کی بڑھتی ہوئی شرح عالمی حدّت کا اہم جز ہے کیونکہ اے سی مشینیں فضا میں جو حرارت چھوڑتی ہیں یہ جہاں اس حفاظتی پرت کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے جو آفتاب کی کرنوں سے زہریلے عناصر کو جذب کر لیتی ہے وہیں یہ فضا کی حرارت میں بھی اضافہ کرتی ہے حالیہ FAO رپورٹ کے مطابق

دنیا کی 1530 ملین مویشی عالمی حدت پر 900 ملین تجارتی اور پرسنل گاڑیوں سے بھی زیادہ اثر انداز ہیں۔ مویشی کے تنفّس اور فضلے سے جو حدت پیدا ہوتی ہے وہ میتھین گیس اور کاربن ڈائی آکسائڈ کے مقابلے میں 23 فیصد زیادہ گرم ہوتی ہے نیز ان کے پیشاب میں امونیا گیس کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے ان سے پیدا ہونے والی حرارت عالمی حدت میں 27 فیصد کی شریک ہے انھی وجوہ کی بنا پر 2003 میں نیوزی لینڈ نے اس پر قابو پانے کے لیے ہر جانور پر 10 نیوزی لینڈ ڈالر ٹیکس لگانے کی پیشکش کی تھی۔ جو کسانوں کی سخت مخالفت کو دیکھتے ہوئے روبہ عمل نہ لائی جاسکی۔ یو کے (U.K.) میں مویشی پر فارٹ ٹیکس Fart Tax لگانے کی تجویز چل رہی ہے تاکہ گائے، بیل، بھینس، بھیڑ وغیرہ کے فضلے پر قابو پایا جاسکے۔ غریب اور ترقی پذیر ممالک میں مویشی کی کثرت GHG کا اہم سبب ہے۔ 2003 کی گنتی کے مطابق ہندوستان میں 285 ملین مویشی ہیں جو پوری دنیا کے 18 فیصد سے زیادہ ہیں۔ اس کی غذائی ضرورت کے لیے تقریباً 50 ملین ہیکٹر زمین استعمال ہوتی ہے جو ملک کی 190 ملین ہیکٹر زرعی زمین کا ایک بڑا حصہ ہے۔

ماحولیاتی حدت اس صدی کا سب سے بڑا چیلنج ہے جو پوری انسانی دنیا کے لیے موجب تشویش ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے تمام ممالک کو متحدہ کوشش کرنی پڑے گی اور اقتصادی ترقی کے لیے متبادل وسائل تلاش کرنے ہوں گے۔ جس سے پوری دنیا کا تیل اور کوئلے پر انحصار کم ہو اور نیوکلیر انرجی پر بھی قابو پایا جائے، تاکہ آنے والی نسل ان خطرات سے محفوظ اس خوبصورت اور سجی ہوئی دنیا میں زندگی بسر کرے۔

□□□

پتہ:
112, Mandavi Hostel, JNU, New Delhi

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

آئندہ شمارے میں قرۃ العین حیدر اور گیان چند جین پر خصوصی گوشہ شامل ہوگا

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

ایس.ایس.رضا

ہندوستانی مردم شماری کا پس منظر

ہندوستان چین کے بعد دوسرا سب سے کثیر آبادی والا ملک ہے جو غالبًا 2040 تک سب سے بڑی آبادی والا ملک بن جائے گا، اگر آبادی میں اضافہ بدستور جاری رہا۔ 2001 کے وسط میں اقوام متحدہ کے تخمینے کے مطابق دنیا کی کل آبادی 6134 ملین میں سے ہندوستان کی آبادی 1025 ملین افراد پر مشتمل تھی۔ دنیا کے صرف 204 فیصد زمینی خطے میں ہندوستان دنیا کے 1608 فیصد آبادی کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ تناسب 1981 کی مردم شماری سے 106 فی صد زیادہ ہے۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں آبادی میں اضافے کا تسلسل پچھلے ہزاروں سال سے برقرار ہے۔ ماضی میں ہندوستان کی آبادی میں اضافہ کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں یہاں کی کل آبادی 100 سے 125 ملین کے درمیان تھی۔ مردم شماری عام طور پر دس سال میں ایک بار کی جاتی ہے۔ جو کہ Demographic معلومات کا اہم ذریعہ ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں آبادی کا تخمینہ چندر گپت موریہ اور اکبر کے دور حکومت میں بھی لگایا گیا تھا لیکن دور جدید میں پہلی بار مردم شماری 1872 میں کی گئی۔ دوسری مردم شماری جو کہ پورے برطانوی ہندوستان کو محیط تھی 1881 میں ہوئی تھی۔ 1881 سے ہمارے ملک میں ہر دس سال پر مردم شماری کا سلسلہ جاری رہا۔ 2001 کی مردم شماری اس سلسلے کی 14 ویں اور تازہ ترین مردم شماری ہے۔

1931 تک ہندوستان میں مردم شماری حقیقی معنوں میں بیک وقت ہونے والا عمل (Synchronous De facts) تھا جب لوگوں کو ان کی رہائش گاہوں پر جا کر گننے کا کام سارے ملک میں ایک رات میں بیک وقت کیا جاتا تھا۔ صرف ان جگہوں کو چھوڑ کر جہاں برف باری ہوتی تھی یا جہاں پہنچنا کسی اور وجہ سے دشوار امر تھا۔ وہاں مردم شماری دوسری مختلف تاریخوں میں کرائی جاتی تھی۔ ایک ہی مقررہ تاریخ میں مردم شماری کا یہ کام 1931 کے بعد ترک کر دیا گیا۔ کیوں کہ ایک ہی دن میں مطلوبہ تفصیلات اکٹھا کرنے کے لیے ملازمین کی بڑی تعداد میں تقرری اور بہتر نگرانی کو یقینی بنانے میں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ 1941 سے مردم شماری کا کام فروری کے ماہ میں تین ہفتوں میں کیا جانے لگا۔ جو اسی De-facto کی اضافی شکل تھی۔ یکم مارچ سے 05 مارچ تک نظر ثانی کا کام انجام دیا جانے لگا۔ 2001 کی مردم شماری میں آبادی کا شمار 09 فروری اور 28 فروری کے درمیان ہوا تھا۔

جغرافیائی حدود کی مناسبت سے انسانوں کی تعداد گننے کا کام کسی بھی مردم شماری کا سب سے آسان لیکن بہت اہم پہلو ہے۔ دور جدید سے قبل کی تمام مردم شماریوں کا خاص مقصد ملٹری سروس کے لیے عمر کا تعین، ٹیکس کا تعین اور ریاست کے تئیں شہریوں کی ذمہ داریوں کا تعین ہوتا تھا۔ جدید مردم شماری صرف Demographic خصوصیات کے اعداد و شمار ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ یہ سماجی و معاشی معلومات بھی فراہم کراتی ہے۔ ہندوستانی مردم شماری ہمیں گھروں، مکانوں، کمروں کی تعداد، ایک کمرے میں رہنے والوں کی تعداد وغیرہ بنیادی سہولتوں مثلاً پینے کے پانی کے ذرائع، کھانا پکانے کا ایندھن وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کراتی ہے۔ 2001 کی مردم شماری میں پہلی بار نقل مکانی کے ذرائع مثلاً سائیکل، موٹر سائیکل، اسکوٹر، موپیڈ، کار، جیپ اور ذرائع ابلاغ اور مواصلات کے وسائل مثلاً ریڈیو، ٹی. وی. اور ٹیلیفون کے بارے میں اعداد و شمار جمع کیے گئے۔

1961 میں ایک نئے شیڈول کے اضافے سے یہ تمام معلومات حاصل ہوئی جسے ہاؤس لسٹ شیڈول (House List Schedule) کا نام دیا گیا۔ 2001 کی مردم شماری میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے ان میں مکانوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ آسائش والے مکان، رہائش کے لائق مکان اور خستہ حال مکان۔

مردم شماری سے ہمیں سماجیات اور اقتصادیات کا ایک مفصل تصویری خاکہ ایک مناسب وقفے سے مسلسل ملتا رہتا ہے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار مختلف قسم کے ترقیاتی پروگراموں کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مردم شماری سے حاصل معلومات حکومت ہند مختلف بین الاقوامی ایجنسیوں کو بھی فراہم کرتی ہے۔ ہندوستانی نقطہ نگاہ سے آبادی میں اضافہ اقتصادی ترقی اور ترقیاتی منصوبہ بندی سے کافی گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سب کے لیے تعلیمی مہم کے مد نظر اور بالخصوص Right to Education Act کے نفاذ کے بعد خواندگی، اسکول میں حاضری اور تعلیمی حصول کے اعداد و شمار اور بھی اہم ہو گئے ہیں۔ مردم شماری سے حاصل اعداد و شمار کی مدد سے حکومت اس سلسلے میں ہوئی ترقی کو Monitor کر سکتی ہے۔ سماجی علوم کے ماہرین قبیلے، ذات، مذہب و نسل کی بنیاد پر سماجی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے فرق کو جاننے کے لیے ان اعداد و شمار کا استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کے سیاسی نظام کی بنیاد بالغ رائے دہندگی پر ہے اور رائے دہندگی کی کم سے کم عمر 18 سال کر دینے کے بعد سیاسی ماہرین نے مذہب، فرقہ، خواندگی، دیہی و شہری رہائش اور پیشے وغیرہ پر مبنی عوامی رجحان کو سمجھنے کے لیے مردم شماری کے اعداد و شمار میں کافی دلچسپی دکھائی ہے۔ یہ اعداد و شمار تجارت اور صنعت، خوردہ تجارت اور مواصلاتی نظام میں بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

مردم شماری کا کام چونکہ ایک بہت بڑا عمل ہے۔ اس لیے مردم شماری میں کچھ لوگ شامل نہ ہو سکیں یا کچھ ایک بار سے زیادہ شمار کر دیے جائیں اس کے بہت امکانات ہیں۔ ان غلطیوں کا تدارک کرنے کے لیے 1951 کی مردم شماری میں ایک نظام کا جسے "Post-Enumeration Check" کے نام سے جانا جاتا ہے نفاذ ہوا۔ 1961 کی مردم شماری میں اس میں مزید اصلاحات کی گئیں۔ موجودہ نظام میں ایک نمونہ ''دو ہزار میں ایک'' کے اصول پر کیا جاتا ہے۔ اور اس سے اصل مردم شماری کے 15 سے 30 دنوں کے اندر نگرانی عملے کے ذریعے دوبارہ شمار کیا جاتا ہے اور اس طرح حاصل شدہ نتیجے کا موازنہ مردم شماری کے شمار سے کیے جانے پر غلطیوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

□□□

پتہ
C-320/2, Shaheen Bagh
Abul Fazal Enclave Part-II
Okhla Extention, New Delhi-110025

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئر پرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

تکنیک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید۔ ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)

قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

اقبال کی کہانی (پاپولر ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ بھی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

زبیر احمد بھاگلپوری

لیب ٹیکنیشین کے لیے روزگار کے مواقع

موجودہ دور میں معالجے کے سلسلے میں ڈاکٹروں کے علاوہ لیب ٹیکنیشین کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ لیب ٹیکنیشین کا کام تکنیکی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ مریضوں کے بلغم، خون، پیشاب، پاخانہ وغیرہ کے نمونوں کی کیمیاوی جانچ کرتے ہیں اور جانچ کے نتیجے میں حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کرکے تفصیلی رپورٹ تیار کرتے ہیں۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر ڈاکٹر مریض کے لیے دوا تجویز کرتا ہے اور اس کے علاج کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے۔

لیب ٹیکنالوجی: (ایم۔ایل۔ٹی) تربیت یافتہ، تجربہ کار اور باصلاحیت لیب ٹیکنیشین کے لیے سرکاری، نیم سرکاری، نجی نرسنگ ہوم اور کلینکوں وغیرہ میں روزگار کے مواقع فراہم کررہی ہے۔ چند بیماریوں کا کامیاب علاج مرض کی ظاہری علامات کی بنیاد پر ممکن ہے لیکن کئی امراض، مثلاً ملیریا، ایڈس، ہیپے ٹائٹس۔بی، پیلیا اور ٹی بی وغیرہ کا علاج محض علامات کی بنیاد پر کرنا مریض کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ بہت سی علامات کئی بیماریوں میں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ اس سے کسی ایک بیماری کو نشانہ بنا کر جو علاج کیا جائے گا اس کا منفی اثر بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مرض کی حقیقی نوعیت کا پتہ لگانا ڈاکٹر اور مریض دونوں کے لیے سودمند ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح مادری (Maternal) یا پدری (Paternal) صلاحیت کا اندازہ محض خارجی علامات کی بنیاد پر نہیں لگایا جاسکتا۔ ان سب کے لیے ایک تجربہ کار لیب ٹیکنیشین کی خدمات حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔

ایک قابل اور باصلاحیت ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے لیب ٹیکنیشین کی اہمیت اب تسلیم کی جاچکی ہے۔ آج ہمارے سماج میں متعدی امراض (Infections Diseas) جس تیزی سے پھیل رہے ہیں، اس کے مدنظر لیب ٹیکنیشین کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس طرح میڈیکل کے شعبے میں دلچسپی رکھنے والے امیدواروں کے لیے لیب ٹیکنالوجی روزگار کا ایک اچھا میدان ہے۔ ملک کے کئی ادارے مناسب تربیت دے کر باصلاحیت اور ماہر لیب ٹیکنیشین کو تیار کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ اس کے لیے خواہشمند امیدوار کو میڈیکل لیب ٹیکنیشین کا ڈپلوما کورس کرنا ہوتا ہے۔ دوران تربیت طلبہ کو پیتھولوجی، بایوکیمسٹری اور مائکروبایولوجی جیسے مضامین سے اصولی اور عملی طور پر روشناس کرایا جاتا ہے۔ لیبوریٹریز میں استعمال ہونے والے جانچ کے مختلف طریقوں سے متعلق حقائق کی جانکاری دی جاتی ہے۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ جانچ کے بعد رپورٹ تیار کرنے میں کن کن باتوں کے لیے احتیاط برتنا چاہیے۔ جانچ کے آلات کے رکھ رکھاؤ اور اس کے خوش اسلوبی سے استعمال کے بارے میں واضح جانکاری حاصل کرنا اس ٹریننگ کا حصہ ہوتا ہے۔

(الف) داخلے کے لیے کم سے کم اہلیت (Minimum Qualification for admission) بایولوجی، کیمسٹری اور فزکس مضامین کے ساتھ میٹرک پاس طلبہ وطالبات اس کورس میں داخلہ لینے کے اہل ہوتے ہیں۔

سرکاری اداروں میں داخلے کے خواہشمند امیدواروں کو ایک تحریری امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ یہ امتحان معروضی نوعیت (objective type) کے ہوتے ہیں۔ سوالات کا تعلق خاص طور سے بایولوجی، کیمسٹری اور فزکس سے ہوتا ہے۔

معروف قومی اخباروں میں داخلے سے متعلق اطلاعات متعلقہ اداروں کی طرف سے وقت پر شائع کی جاتی ہیں۔ لہٰذا امیدواروں کو چاہیے کہ اخباروں کا مطالعہ باقاعدگی اور توجہ سے کرتے رہیں۔ ذاتی سطح پر خط کے توسط سے متعلقہ اداروں سے تفصیلی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ہندی لسانی ریاستوں میں قائم سرکاری اداروں میں مطالعے یا تدریس کا میڈیم ہندی یا انگریزی ہوتا ہے، دیگر ریاستوں میں واقع اداروں میں ذریعۂ تدریس انگریزی یا اس ریاست کی مقامی زبان ہوتی ہے لیکن ترجیح انگریزی زبان کو ہی دی جاتی ہے۔

مدت نصاب (Course Duration) دوسال ہے۔

لیب ٹیکنیشین کے لیے یوں تو کئی شعبوں میں روزگار کے مواقع موجود ہیں لیکن خاص طور سے درجۂ ذیل شعبوں میں ان کے لیے بہت سے مواقع ہیں۔

(i) سرکاری اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں

(ii) نجی اسپتالوں اور نجی پریکٹس کرنے والے ڈاکٹروں کے یہاں

(iii) پرائمری ہیلتھ سنٹروں میں

(iv) ایسے غیر سرکاری اداروں میں جو صحتی خدمات سے منسلک ہیں۔

(v) نجی جانچ مرکز قائم کرکے بھی اچھی آمدنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

وقتاً فوقتاً ملک کے معروف اخباروں اور روزگار سماچاروں میں شائع ہونے والے اشتہارات کے ذریعے اس زمرے میں پائے جانے والے روزگار کے مواقع کے بارے میں جانکاری حاصل کی جاسکتی ہے۔

ملک کے سرکاری اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں کام کرنے والے لیب ٹیکنیشین کو تقریباً دس سے پندرہ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ملازمت کے لیے بیرون ملک چلے جاتے ہیں تو وہاں زیادہ تنخواہیں حاصل کرسکتے

ہیں، چونکہ یہ ایک ٹکنیکی ڈگری ہے۔ روزگار کے مواقع ہر جگہ دستیاب ہیں۔ چاہے عرب ممالک ہوں، یورپی ممالک ہوں امریکہ ہو یا دنیا کا کوئی اور ملک۔

تربیتی ادارے:

(1) آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، نئی دہلی

(2) پٹنہ میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل (P.M.C.H)، پٹنہ

(3) موتی لال نہرو میڈیکل کالج، الہ آباد

(4) مدورائی میڈیکل کالج، مدورائی تمل ناڈو

(5) بی۔آر۔ڈی میڈیکل کالج، گورکھپور

(6) آسام میڈیکل کالج، ڈبروگڑھ

(7) کرناٹک میڈیکل کالج، ہبلی

(8) جی۔آر۔ میڈیکل کالج، گوالیار

(9) آندھرا میڈیکل کالج، وشاکھاپٹنم

(10) اندرا گاندھی میڈیکل کالج، شملہ

(11) گاندھی میڈیکل کالج، بھوپال

(12) گورنمنٹ میڈیکل کالج، پٹیالہ

ان کے علاوہ بھی بہت سے سرکاری و غیر سرکاری ادارے ایسے ہیں جہاں لیب ٹیکنالوجی کا کورس شروع ہوا ہے۔ طلبہ کو چاہیے کہ اس کی تفصیلی معلومات اپنی سطح پر حاصل کریں اور جہاں سہولت ہو، وہاں داخلہ لیں۔

□□□

پتہ:
Deptt of Urdu, Bihar Legislative Council, Patna

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مختار ٹونکی

کمپیوٹر کمپوزنگ بمقابلہ خطاطی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار، ترقی کے موجودہ دور میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر ہر شعبۂ حیات میں اپنے قدم جما چکے ہیں لیکن انھوں نے ہمارے سامنے بہت سے چیلنج اور خدشات بھی کھڑے کردیے ہیں۔ اگر ہم صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مشین اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی اور انسانی زندگی میں ان کے غالب عمل و خل کے باوصف اہل فکر و نظر ایک نوع کے احساس زیاں سے دوچار ہیں بلکہ ادب اور فن کے مستقبل کے حوالے سے اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار بھی ہیں۔ ٹیکنالوجی نے جہاں تجارت، سیاست، معاشیات اور سماجیات میں معاندانہ اطوار و اضداد پیدا کردیے ہیں وہیں ادب اور آرٹ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ فن خطاطی بھی جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث ایک بہترین آرٹ ہے، اسے بھی کمپیوٹر کیلی گرافی نے منفی طور پر متاثر کیا ہے۔

فنون لطیفہ کی درجہ بندی مختلف طرح سے کی جاتی ہے اور خطاطی کا شمار بھی فنون لطیفہ میں کیا جا سکتا ہے۔ خوشخطی، خوش نویسی، کتابت، کتبہ نگاری، خطاطی، طغریٰ نویسی ایک ہی زمرے کے فنون ہیں اور ان کی اساس کسی رسم الخط کے حروف کی آرائشی اور تزئینی طرز تحریر پر ہے۔ خطاطی، خوش نویسی کی ایک پر آرائش اور پیچیدہ شکل ہے جسے اسلامی آرٹ میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر خلیل الرب کے لفظوں میں:

"اسلامی آرٹ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ بازنطینی اور ساسانی آرٹ کے گہرے اثرات کے باوجود اس میں بلا امتیاز زمان و مکاں خیال اور عقیدے کی وحدت اور یکسانیت جاری و ساری رہی ہے۔ اس ارتقا میں یہ حد بندی اثر انداز تھی کہ اسلام میں فنون کی وہ شکلیں ممنوع تھیں جن میں شرک کا شبہ ہو، یہی سبب ہے کہ اسپین یا ہندوستان کی خطاطی ہو، روم کے دروازوں کی مرصع کاری ہو، استنبول میں شاہ سلیمان کے مقبرے پر ٹائلوں کی نقاشی ہو، سیریا اور مصر کے برتن اور مساجد کے محراب و طاق اور قندیلوں کی تزئین کاری ہو، ایران میں مخطوطوں کی طلاکاری ہو، زربفت و کمخواب پر زردوزی کی پرکاری ہو، ان سب میں خیال اور عقیدے کی وحدت دیکھی جا سکتی ہے۔"

خطاطی کے بنیادی اصول و آداب مرتب ہو جانے کے بعد اختراع پسند خوش نویسوں نے مقامی اثرات کے تحت اپنی جدت طرازی کے جوہر دکھانے کے لیے حروف کی ساخت اور ملاوٹ میں نوک پلک کی تراش خراش اور تحریر میں جلی خفی شان و صفا کی صورتیں پیدا کر کے نئی نئی روشیں نکالیں اور اس طرح آرائشی خطوط کی درجنوں شکلیں وجود میں آگئیں۔ پھر ان مروجہ خطوط میں بھی خصوصیت و امتیاز حاصل کرنے کے لیے ماہرین فن نے دائرہ، کشش، کرسی، حروف کے حجم، توازن اور اعراب کے آرائشی استعمال میں اپنی ذہانت کی جو لانیاں اور موشگافیاں دکھائیں۔ ایک رنگ میں سو رنگ دکھانے کے مصداق بعضوں نے بیل بوٹوں سے پیکر تراشی کر کے اپنے خطوں کو واقعی گلزار و گلنار بنا دیا جس کا ایک زمانہ معترف ہے۔

اس کے برعکس کمپیوٹر کیلی گرافی اور کمپوزنگ کی حدیں محدود ہیں۔ اگر ہم کمپیوٹر کے سسٹم کا موازنہ انسانی دماغ سے کریں اور مغز کو ہارڈ ویر اور سوچنے سمجھنے کے عمل کو سوفٹ ویر مان لیں تو آنکڑوں کے جوڑ توڑ میں تو مشین انسان سے بہتر ہوگی لیکن وہ نہ تو حادثاتی مراحل اور ان دیکھے حالات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ نالج کو انسانی دماغ کی طرح منظم کرسکتی ہے۔ اندھی، بہری، گونگی اور بے دماغ مشینوں کو لاکھ بصیرت اور بصارت دینے کی کوشش کی جائے قوت لامسہ، قوت باصرہ اور قوت شامہ سے انھیں پر قوت بنایا جائے انسانی دماغ جیسی توانائی ان میں پیدا نہیں ہوسکتی۔ ویسے بھی جو آرٹ احساسات و جذبات سے عاری ہو، وہ کسی بھی طرح محترم اور وقیع قرار نہیں دیا جا سکتا:

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی است

کمپیوٹر خطاطی ان کاغذی اور نمائشی پھولوں کی سی ہے جنھیں صرف زیب و زینت کی خاطر گلدانوں میں سجایا جاتا ہے۔ فطری ترو تازگی اور لطافت و جاذبیت سے معریٰ مصنوعی پھول اپنی تمام تر کرشمہ کاریوں کے باوجود دل و نگاہ کو فرحت و انبساط نہیں بخش سکتے۔

مشینیں لاکھ اپنے حیرت کدے سجاتی رہیں مگر وہ ادب اور فن کی ایک مجلس یا بزم کی سحر آفرینی کا جواب نہیں لا سکتیں۔ اسی طرح کمپیوٹر خطاطی ہزار گلستاں ترتیب دے لے وہ دستِ خطاط کی تزئین و آرائش کا بدل نہیں بن سکتے۔ کچھ سال پہلے لکھنؤ کے ایک خطاط ہاشم اختر نقوی نے "بسم اللہ" کو تین ہزار طریقوں سے رقم کر کے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ کیا کمپیوٹر خطاطی یہ کارنامہ انجام دے سکتی ہے؟ کویت کے تجریدی آرٹ کے ماہر خطاط فرید عبد

الرحیم العلی نے لفظ "اَللّٰہ" پر مشتمل چار حروف کو مختلف شکلوں میں اسمائے حسنیٰ کے عدد کے مطابق ننانوے طریقے سے طغروں کا روپ دیا ہے اور اسم "محمدؐ" کو بھی پانچ سو طریقوں سے مرقوم کر کے اپنی مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ کیا کمپیوٹر ایسی شاہکار خطاطی کے نمونے پیش کر سکتا ہے؟ سلطان القلم محمد خلیق ٹونکی نے بمبئی کے جج ہاؤس پر جلی حروف میں خطاطی دکھائی ہے کیا کمپیوٹر مشین اتنے موٹے حروف رقم کر سکتی ہے؟ کیا یہ ایک خطاط کی طرح چاول کے دانے پر "قل ھو اللّٰہ" رقم کر سکتی ہے؟ جواب با صواب یہی ہوگا کہ "ہرگز نہیں۔" کمپیوٹر خطاطی نہ تو کسی قسم کی مہارت اور ہنر مندی کا مظاہرہ کر سکتی ہے نہ نئے نئے پیٹرن بنا کر کوئی تنوع پیدا کر سکتی ہے کیونکہ یہ خود ایک خطاط کی محتاج ہے۔ فلاپی، ڈسک، ای میل، انٹرنیٹ وغیرہ کی روزمرہ کی زندگی میں اہمیت و افادیت تسلیم مگر یہ جذباتی کیفیات کی ترجمانی ہرگز نہیں کر سکتے یعنی کمپیوٹر خطاطی اصلی خطاطی کا بدل ثابت نہیں ہو سکتی۔

بلا شبہ کمپیوٹر نے ہمیں بہت سی سہولتیں دستیاب کرا دی ہیں اور خطاطی و کتابت کی کئی دشواریوں کو آسانیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ جو کام خطاط و کاتب حضرات ہفتوں اور مہینوں میں انجام دیتے تھے، اسے کمپیوٹر گھنٹوں اور دنوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے لیکن خطاطی ایک بڑا فن ہے اور اس فن کا ختم ہو جانا اپنی ایک تہذیبی وراثت کا گم ہو جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب ان میں بیشتر رسائل کمپیوٹر کمپوزنگ کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اول تو کمپیوٹر کمپوزنگ میں وہ حسن کاری اور نفاست نہیں ہوتی جو ایک خوش نویس کاتب کے ہاتھوں کتابت کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ کمپیوٹر مشین بسا اوقات حروف و الفاظ کو گتھم گتھا کر دیتی ہے اور قاری اسے دیکھ کر پس و پیش میں پڑ جاتا ہے۔ بہت سے مفرد الفاظ بغل گیر ہو کر کمپیوٹر کمپوزنگ کی خامی کو بتاتے ہیں۔ سوم یہ کہ کاتب کتابت کے دوران خوشنویسی کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہیں اور الفاظ کی نشست و برخاست کا خصوصی طور پر اہتمام کرتے ہیں۔ سطر در سطر وہ موزونیت اور حروف کا توازن قائم رکھتے ہیں اگر کہیں سطر ان کے مسطر سے باہر ہو رہی ہے تو وہ اپنے قلم کے رکھ رکھاؤ سے سطور کی یکسانیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کمپیوٹر کمپوزنگ چونکہ مشینی ہوتی ہے اس لیے اس میں کبھی کبھی یہ خرابی در آتی ہے کہ الفاظ تقسیم ہو کر ایک سطر سے دوسری سطر میں چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک سطر کا آخری لفظ "بلاغت" ہے مگر مسطر میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ پورا لفظ لکھا جا سکے تو رواں سطر میں صرف "بلا" اور "غت" اگلی سطر میں کمپوز ہو کر غت ربود کی صورت پیدا کر دے گا۔ چہارم یہ کہ کاتب کے ہاتھوں میں ہنر مندی ہوتی ہے اس لیے وہ صفحۂ قرطاس کی بساط پر حروف و الفاظ کے مہرے بہت سوچ سمجھ کر مناسب جگہ پر فٹ کرتا ہے۔ "جگہ" اس کے ہاتھوں میں ضائع نہیں ہوتی۔ کمپیوٹر کمپوزنگ بہت کھلی کھلی ہوتی ہے اس لیے اس میں جگہ (Space) کا زیاں لازمی ہے۔ پنجم یہ کہ کمپیوٹر کیلی گرافی یا کمپیوٹر ڈیکوریٹیو کمپوزنگ میں پہلے کسی ڈیزائن کے پیٹرن کو ترتیب دینا ہوتا ہے پھر اسے اَن ہملیسنڈ کرنا ہوتا ہے۔ اس عمل میں کبھی کبھی قباحت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ششم یہ کہ کمپیوٹر ہینڈ اگرچہ تربیت یافتہ ہو مگر فن خطاطی کی ابجد سے ناواقف ہو تب بھی کارکردگی متاثر ہوگی۔

کمپیوٹر کیلی گرافی نے روایتی خطاطی کے ہنر مندوں کے سامنے یہ سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے کہ وہ جائیں تو جائیں کہاں۔ آزوقۂ حیات پائیں تو پائیں کہاں۔ کمپیوٹر فی الواقع خطاط حضرات کی معاشیات پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ مستقبل قریب میں خطاطی کے سب تار و پود بکھر جائیں گے اور کتنے ہی زریں قلم، اعجاز رقم گمنامی کی وادیوں میں کھو جائیں گے۔

□□□

پتہ:
Kali Paltan Road
Pul Mohd. Khan.
Tonk - 304001, (Rajasthan)

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی "فکر و تحقیق" سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

سید محمد مہدی (ہماری مطبوعات سے)

کہاں گئے وہ لوگ

(بیگم اختر اور نینا دیوی کی یاد میں)

صبح ریڈیو کھولا تو فرحت جہاں ہتو راگ الہیا بلاول گا رہی تھیں۔ بول تھے: کہاں گئے وہ لوگ دیا: برج کے بسیا

آواز میں لوچ تھا، تانوں میں پکار تھی: مرلی والے ہم برج کی گوپیوں کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔

ابھی یہ گانا ختم ہی ہوا تھا کہ کسی نے گراموفون پر دلاری بائی کا ریکارڈ لگا دیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی لذیذ چیز کھا رہے ہوں اور یکا یک دانتوں کے نیچے کنکر آ جائے۔ خرافات شعر، بھونڈا گانا:

یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل
مٹنے والوں کو مٹائے دردِ دل
دردِ دل بھی کیا کوئی معشوق ہے
جس کو دیکھو جتلائے دردِ دل
رات دن لیلیٰ پڑی رہتی ہے یوں
اپنے پہلو میں دبائے دردِ دل

یہ کوئی ساٹھ پینسٹھ برس پرانی بات ہے۔ آہستہ آہستہ ہم اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ غزل گانے کی چیز نہیں ہے۔ یہ خیال ذہن میں اس وقت اور زیادہ جم گیا۔ جب اختری بائی فیض آبادی کی اس قسم کی غزلیں سنیں:

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشہ نہ بنا دے

غزل کے ہر شعر کا موڈ، اس کی فضا دوسرے شعر سے مختلف ہوتی ہے۔ پھر ہر بحر کی ایک لے ہوتی ہے جو پوری غزل کو باندھے رکھتی ہے۔ غزل کی ایک دھن بنائی گئی۔ سارے شعر اسی دھن اسی لہجے، اسی لے میں گائے جائیں گے۔ وہ فراق ہو یا وصال سب کی دھن ایک، ہر مال ملے گا چار آنے۔

لیکن ایک دن اختری بائی کی گائی ہوئی ایک غزل سنی تو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ غزل تھی:

چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

حیرت اس بات پر کہ اختری بائی نے ایک اچھی غزل گائی اور خوشی اس بات کی کہ انھوں نے گائی بھی اچھی جو کوئی نئی بات نہ تھی۔

پکے گانے کے ساتھ ساتھ اب کبھی کبھی کوئی غزل بھی اچھی لگنے لگی اور پھر یوں ہوا کہ ہم نے ایک ناٹک لکھا ''جان غزل''۔ جب دہلی آرٹ تھیٹر کی ڈائرکٹر شیلا بھاٹیہ نے اسے اسٹیج کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی میوزک ڈائرکٹر ہوئیں بیگم اختر۔

ہمیں بیگم اختر کی غزل نہیں ٹھمری، دادرا اور کجری وغیرہ اچھی لگتی تھیں لیکن اب وہ ''جان غزل'' کی میوزک ڈائرکٹر کی حیثیت سے آ رہی تھیں اور انھیں غزلوں کی دھنیں بنانا تھیں۔ ان کا بڑا نام تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈرامے کی کامیابی کا ضامن تھا لیکن ہم ابھی شک وشبہ میں گرفتار تھے۔

مگر وہ آئیں۔ انھوں نے دھنیں بنائیں اور سکھائیں اور وہ کامیابی کے جھنڈے گاڑ گئیں۔

بہت ملنسار خلیق اور زندہ دل خاتون تھیں۔ ڈرامے کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ جب بھی دہلی آتیں یا میں لکھنؤ جاتا تو ملاقات ضرور ہوتی۔ اکثر فرمائش ہوتی تھی کہ اچھی اچھی معیاری غزلیں تلاش کرکے دیجیے اور معنی سمجھایئے۔ پھر ہارمونیم لے کر بیٹھتیں اور دھن بنانا شروع کر دیتیں۔ پھر گا کے سناتیں اور پوچھتیں یہ دھن کیسی ہے؟ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہم پکا گانا سننے کے شوقین ہیں تو کبھی کبھی بتاتیں کہ دیکھیے اس راگ میں ہم نے اس غزل کو کس طرح بٹھایا ہے۔ ہم نے کہا سنیے ہم راگ راگنیاں بہت زیادہ پہچانتے نہیں ہیں صرف چند ہی راگ پہچان سکتے ہیں۔ آپ کو ہم جیسے لوگوں کے سامنے گاتے ہوئے کیا اچھا لگتا ہے۔ استادوں کے سامنے گاؤ تو وہ ترازو لے کر بیٹھ جاتے

''چند تصویریں، چند خطوط'' سے ماخوذ از سید محمد مہدی، صفحات۔ 221، قیمت: -/80 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہیں اور تولا کرتے ہیں کہ کون سُر گر گیا کون سر دب گیا۔ انھیں تو صرف مین میخ نکالنے میں مزہ آتا ہے۔

ان کو اس بات کا ذاتی تجربہ تھا۔ ایک زمانے میں استادانِ فن نے حکم لگا دیا تھا کہ اختری بائی کی آواز میں پتی ہے۔ بات تو صحیح تھی لیکن جب انھوں نے آواز کے اس نقص کو اپنی اُپج سے حسن میں بدل دیا تو یہ لوگ کچھ عرصے تک تو خاموش رہے لیکن بعد میں تسلیم کرنا پڑا کہ ہاں صاحب اختری کی آواز لاجواب ہے جس میں ایک خاص کشش ہے۔

بیگم اختر کا تعلق اس گروہ سے تھا جس کا پیشہ تھا گانا بجانا اور اپنے گانے سے لوگوں کو خوش کرنا اور لبھانا۔ ان کی ماں بھی بہت اچھا گاتی تھیں۔ بیٹی کو پٹیالہ گھرانے کے استادوں کی شاگردی میں دے دیا۔ اسی لیے ان کے گانے میں لکھنؤ اور پٹیالہ گھرانوں کی گائکی کا امتزاج نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ اپنی ماں کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ ہماری اماں کے پاس ایک بہت بڑی سی سیاہ رنگ کی کار تھی۔ کلکتہ میں ہم دونوں اس میں بیٹھے ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو جارہے تھے۔ ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک آدمی گاڑی کے نیچے آتے آتے رہ گیا۔ ڈرائیور نے زور سے بریک لگایا۔ اماں کے منہ سے نکلا "یا علی بچانا سالے کو"۔ ایک مرتبہ ملنے گیا تو ایک خط میری طرف بڑھایا او ربولیں "بتایئے ہم کیا جواب دیں؟" خط سردار خشونت سنگھ کا تھا جو ان دنوں "السٹریٹڈ ویکلی" کے ایڈیٹر تھے۔ لکھا تھا کہ رسالے کا ایک خاص نمبر ہندوستان کے ممتاز شیعوں کے متعلق نکلے گا۔ اس شمارے کے لیے اپنے متعلق تفصیلی معلومات ہمیں بھیج سکیں تو نوازش ہوگی۔ ہم نے کہا کہ آپ شیعہ کب سے ہوگئیں؟ کہنے لگیں "ہم آدھے شیعہ تو ہیں ہی نا!" اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

اس اجمال کی تفصیل کچھ لوگوں نے یہ بتائی کہ سرسید وزیر حسن ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں میں تھے۔ الہٰ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔ ان کے بھائی کے تعلقات فیض آباد کی ایک گانے والی خاتون سے ہوگئے اور ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام رکھا گیا اختری اور وہ شیعہ تھے۔

ایک مرتبہ جب ریڈیو کے ایک انٹرویو میں بیگم اختر نے اس بات کا ذکر کیا اور براڈکاسٹ ہونے سے پہلے اس کی اطلاع وزیر حسن خاندان کی ایک ایسی خاتون کو ملی جن کا تعلق آل انڈیا ریڈیو سے تھا تو انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے اسے نشر ہونے سے روک دیا۔

اختری بائی ٹھمری، دادرا، کجری اور چیتی وغیرہ بہت خوبصورتی سے گاتی تھیں۔ ایک تو ان کی آواز اور اوپر سے گانے کا انداز دلوں پر اثر کرتا تھا لیکن جس چیز نے انھیں سارے ملک میں مشہور کردیا وہ تھا ان کا غزل گانا۔ سوسائٹی کے ہر طبقے میں وہ مقبول ہوئیں۔ ریکارڈ پر ریکارڈ نکلتے رہے۔ رام پور کے نواب رضا علی خاں کے یہاں ملازم رہیں پھر نظام حیدرآباد کے چھوٹے بیٹے معظم جاہ کے یہاں نوکر ہوئیں۔

ایک بار حیدرآباد کا ذکر آیا تو کہنے لگیں کہ ایک مرتبہ معظم جاہ کے یہاں سے پیغام آیا کہ حیدرآباد آؤ۔ اس زمانے میں ایک نوجوان لڑکی شانتی کو گانے کی تعلیم دے رہی تھیں۔ ان کے والدین سے کہا کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد جانا ہے اس لیے آپ کی بیٹی کو تعلیم نہ دے سکوں گی۔ شانتی کی ضد کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ ان کے والدین کا بھی اصرار کہ ساتھ لیتی جایئے۔ بیگم اختر معظم جاہ کے درباریوں سے بخوبی واقف تھیں۔ انھیں ڈر تھا کہ جوان لڑکی کی ذمے داری کس طرح لوں کہ وہاں انتہائی غیر ذمے دار لوگوں کا مجمع، اگر کہیں "میاں" یعنی معظم جاہ کا دل آگیا تو کیا ہوگا لیکن جب شانتی اور شانتی کے والدین کا اصرار بڑھا تو شانتی کو ساتھ لے کر حیدرآباد پہنچیں۔ ترکیب یہ سوجھی کہ جاتے ہی سب سے پہلے شاہد صدیقی سے ملیں۔ شاہد صدیقی خوش گو شاعر، بذلہ سنج انسان، معظم جاہ کو غزلیں کہہ کر دیتے تھے۔ شاہد سے کہا: بھائی شانتی کو معظم جاہ کی نظروں سے بچائے رکھنا ہے۔ کہنے لگے یہ ذمے داری میری۔ چند دن کے بعد دیکھتی کیا ہوں کہ شاہد صاحب خود شانتی کے عشق میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں۔ معظم جاہ سے اجازت مانگی اور شانتی کو لے کر واپس آگئی۔

بہت سے رئیس، نواب، شاعر اور ادیب خود ان کے عشق میں مبتلا ہوئے لیکن انھیں عشق ہوا تو اشتیاق عباسی سے۔ وہ بارہ بنکی کے زمیندار، بیرسٹر، لکھنؤ کے سربرآوردہ شہری، انتہائی مہذب اور مرنجاں مرنج قسم کے انسان۔ اودھ کے قصباتی شرفا کے بہترین نمائندے۔ نام تو تھا ان کا اشتیاق مگر اشتیاق اختری کو زیادہ تھا۔ ایک مشترکہ دوست اور رازداں ایسے وقت کام آئیں۔ ادھر سے کچھ شرطیں پیش کی گئیں ادھر قبول کی گئیں۔ آخر اشتیاق عباسی کے ساتھ اختری بائی فیض آبادی کی شادی ہوگئی۔

اشتیاق عباسی سے شادی کے بعد اختر بائی فیض آبادی بیگم اختر ہوگئیں۔ اس شادی کے لیے انھیں کچھ قربانی بھی دینی پڑی یعنی گانا بند، جس فن کی بدولت اختری اور عباسی کا ملاپ ہوا تھا خود اسی کو دیس نکالا مل گیا۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ بیگم اختر کو ٹی بی ہوگئی۔ ڈاکٹر بنرجی نے جن کی بیوی بیگم اختر سے گانا سیکھتی تھیں عباسی صاحب سے کہہ دیا کہ اگر ان کے گانے پر پابندی عائد رہی تو یہ جلد ہی اللہ کو پیاری ہوجائیں گی۔ چلیے پابندی ختم۔ بیگم اختر بڑی شان و تمکنت کے ساتھ موسیقی کی محفلوں میں واپس آئیں اور ملکۂ غزل کہلائیں۔ لکھ لٹ تھیں۔ لاکھوں کمائے، لاکھوں سے زیادہ لٹائے، نہ جانے کتنی لڑکیوں کو وظیفے دیتی تھیں کتنی لڑکیوں کی شادی دھوم دھام سے کرائی۔ کسی شاگرد سے کبھی کوئی فیس نہیں لی بلکہ ان پر الٹا خرچ کیا۔

گانے پر پابندی تو اٹھ گئی لیکن لکھنؤ اور اس کے اطراف میں گانا منع تھا۔ لکھنؤ میں انھیں بیگم عباسی کی حیثیت سے زندگی گزارنی تھی اور یہیں سے ان کی کشمکش کی زندگی کا آغاز ہوا۔ عزت اور احترام انھیں دونوں زندگیوں میں حاصل ہوا لیکن ایک زندگی میں کچھ اوروں کی طرف سے اور کچھ اپنی طرف سے مسلط کی ہوئی پابندیاں تھیں اور ان پابندیوں کا ایک ہی پیغام تھا کہ اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لو، اپنے ماضی کو بھول جاؤ، لیکن ماضی کو حرف غلط کی طرح مٹایا تو نہیں جاسکتا، بیگم اختر بھی نہیں مٹاسکیں۔

میں نے کئی بار انھیں عجب وحشت کے عالم میں دیکھا۔ دہلی میں جس ہوٹل میں ٹھہرتی تھیں وہاں گیا تو دیکھا بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بیگم اختر حسب معمول ہنس ہنس کر باتیں کررہی ہیں کہ دفعتاً اٹھیں اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ساتھ میں ان کی ایک شاگرد۔ کمرے میں جاکر جن کی بوتل نکالی اور پینا شروع کردیا اور رونے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی شاگرد اور کوئی دوست چپ کرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان کا رونا بند نہیں ہوتا۔ شاگرد ان کو بستر پر لٹا دیتی ہے اور وہ روتے روتے سو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ لکھنؤ گیا تو انھوں نے اپنے یہاں کھانے پر بلایا۔ عباسی صاحب اور ان سے لکھنؤ کے متعلق دلچسپ باتیں ہوتی رہیں پھر سب اٹھ کر کھانے کے کمرے میں گئے۔ وہاں ایک خاتون میز لگا رہی تھیں۔ صورت کچھ کچھ بیگم اختر سے ملتی تھی۔ میں شاید انھیں کچھ حیرت سے دیکھنے لگا تو بیگم اختر بولیں ''یہ میری بہن ہیں'' چلیے بات آئی گئی ہوگئی۔ جب دہلی واپس پہنچا تو بیگم اختر کی ایک شاگرد سے ملاقات ہوئی جو انھیں لکھنؤ کے قیام کے زمانے سے جانتی تھیں۔ باتوں باتوں میں میں نے بیگم اختر کی بہن کا ذکر کیا تو شاگرد سرگوشی کے انداز میں بولیں ''یہ بات کسی اور سے کہیے گا نہیں۔ وہ ان کی بہن نہیں ان کی بیٹی ہیں'' کیا وہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑ سکتی تھیں؟

ایک بار شام کو ہمارے تھیٹر کے دفتر پہنچ گئیں ان کی ایک عزیز شاگرد ساتھ تھی۔ کہا ذرا ہمارے ساتھ چلیے۔ سارا کام چھوڑ کر ان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں گنگنانے لگیں؟ ''جھانک جھروکے سے او متوالے'' کہنے لگیں: یہ بول کیسے لگے؟ ہم نے کہا اچھے ہیں۔ بولیں ذرا اس پر کچھ اور مصرعے لگا کر اسے مکمل گیت بنا دیجیے۔ ہم نے کہا صاحب سنیے ہم نے ساری زندگی ٹھمری دادرا کے بول نہیں لکھے ہم اس فن شریف میں بالکل کورے ہیں۔ کہنے لگیں ہم کچھ نہیں جانتے اسی وقت اور ابھی کچھ بول لکھ دیجیے۔ ہوٹل پہنچ کر کاغذ پنسل ہمارے حوالے کیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ہم نے ان کی شاگرد سے پوچھا کہ آج کہاں سے آرہی ہیں اور یہ بول ان پر کیوں چھائے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک ریکارڈنگ سے واپس آرہی ہیں وہاں سے چلتے چلتے ایک ایسے شخص کو کھڑکی میں کھڑا دیکھا جن پر ایک زمانے میں جان چھڑکتی تھیں۔ بس جب سے یہ بول دہرائے جارہی ہیں۔

ہم نے وہیں بیٹھ کر دو چار الٹے سیدھے مصرعے لکھ دیے اور انھوں نے انھیں دھن میں باندھنے کی کوشش شروع کردی۔ کیا ماضی ان سے اپنا رشتہ توڑ سکتا تھا؟

ان کے بے شمار عاشق تھے جن سے ظاہر ہے وہ ناواقف تھیں لیکن جن کا ذکر ان تک پہنچ ہی جاتا ہوگا۔ ایک عاشق تھے جو لکھنؤ کی سڑکوں پر لکھتے پھرتے تھے ''ہائے اختری'' ایک سبزی ترکاری بیچنے والے حضرت تھے جو لکھنؤ کے مختلف محلوں میں جاکر شام کو آواز لگاتے تھے۔ ''لٹا دیا ہے اختری کے نام پر لٹا دیا ہے'' اور پھر بیٹھ کر اختری بائی کی گائی ہوئی کوئی غزل گانا شروع کردیتے۔

اختری ایک زمانے میں اپنی آواز کے بل پر خاص و عام کے دلوں پر راج کرتی تھیں۔ اس راج کو بھلانا آسان نہ تھا۔

اور اسی مشکل نے ان کی صحت سے خراج وصول کرنا شروع کیا۔

ان سے آخری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام تھا جس میں کیفی اعظمی نے اپنی غزلیں پڑھیں۔ بیگم اختر نے ان کی غزلیں گائیں اور میں نے اس پروگرام کو کنڈکٹ کیا۔ ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ اسٹوڈیو سے واپس آتے ہوئے بتانے لگیں کہ کل ناگپور جانا ہے۔ وہاں ایک کنسرٹ ہے۔ میں نے کہا طبیعت خراب ہے تو ان لوگوں کو اطلاع دے دیجیے کہ نہیں آسکتی۔ کہنے لگیں نہیں ان لوگوں سے وعدہ کرلیا ہے، انھیں مایوس نہیں کرسکتی اور وہاں سے واپس آکر حج کرنے جارہی ہوں۔ ہم نے کہا سنیے آپ اس سے پہلے دو مرتبہ حج کر چکی ہیں، فرض پورا ہوا۔ بار بار جانا کوئی فرض تو نہیں۔ ہنسیں اور کہنے لگیں ہمارا پچھلا حج خراب ہوگیا تھا۔ ہم نے کہا حج کیسے خراب ہوتا ہے؟ کہنے لگیں ہم نے حج سے واپس آکر جن پی لی تھی۔ ماضی سے رشتہ توڑنا کتنا کٹھن تھا۔

میری ان سے ملاقات 1970 میں ہوئی جب وہ اپنی جوانی کو کوسوں پیچھے چھوڑ آئی تھیں لیکن ان کی شخصیت میں بڑی محبوبیت تھی۔ ان کی ہنسی میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ان کی باتوں میں بڑی معصومیت جھلکتی تھی۔ ظاہر ہے یہ ساری خصوصیات حاصل کرنے میں انھوں نے گانے کے ساتھ ساتھ ان سب کا بھی بہت ریاض کیا ہوگا۔ شعوری کوشش اور ریاض سے حاصل کی ہوئی محبوبیت فطری دلکشی اور بے تکلفی سے زیادہ پرکشش اور اس لیے زیادہ قاتل ثابت ہوسکتی ہے۔

ایک واقعہ ہے جسے میں ان کی سادہ دلی سمجھوں کہ محنت سے حاصل کیا ہوا اپنے اوپر یہ اعتماد کہ کسی کا دل توڑ کر بھی وہ اس دل پر راج کرسکتی ہیں۔ دہلی کے ایک بہت بڑے سے ہال میں وہ گا رہی تھیں۔ ایک دوست کے ساتھ ہم بھی

وہاں پہنچے اور پیچھے کی صف میں بیٹھ گئے۔ ایک معمولی سی غزل گا رہی تھیں۔ دفعتاً ہم دونوں پر نظر پڑی تو گاتے گاتے بولیں "مہدی صاحب دیکھیے ہم ایک بری غزل کتنی اچھی طرح گا سکتے ہیں۔" جن شاعر کی غزل گا رہی تھیں وہ ہال میں موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ کبھی بیگم اختر کو اپنی کوئی غزل گانے کے لیے نہ دیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ اور ان جیسے کئی اور شاعر جو بیگم اختر کے ذریعے شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے بھلا ایسے فقروں سے ناراض ہونے والے تھے! وہ دراصل ایسے تمام شاعروں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں جو اپنی غزلیں ان پر مسلط کیا کرتے تھے۔ وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا لیکن کسی سے یہ کہنا کہ میں آپ کی غزل نہیں گا سکتی ان کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ جب ہم میں سے کوئی کہتا کہ آپ یہ بری بری غزلیں کیوں گاتی ہیں تو بڑی لاچاری سے کہتیں "بتایئے نا ہم کیسے کہہ دیں کہ ہم نہیں گائیں گے۔"

وہ غالباً احمد آباد یا بروڈہ میں اسٹیج پر گا رہی تھیں کہ ہارٹ اٹیک ہوا اور وہیں انتقال ہو گیا۔ شاید گاتے گاتے کوئی سچا لگ گیا اور وہ سچائی سے جا ملیں۔

دہلی میں گانا سننے کا شوق تو بہتوں کو تھا لیکن گانے والوں کی ہر طرح سے مدد کرنا صرف نینا دیوی کو آتا تھا۔

وہ تھیں تو بنگالی لیکن شادی ہوئی تھی پنجاب کے ایک رجواڑے میں۔ اس لیے کہلاتی تھیں رانی رنجیت سنگھ لیکن یہ نام استعمال میں بہت کم آتا تھا۔ سرکاری کام کاج یا سرکاری تقریبوں میں شاید یہی نام لکھا جاتا ہوگا لیکن خواص اور عوام سب کے لیے وہ تھیں نینا دیوی۔ انتہائی منکسر مزاج فراخ دل اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ گانے کا شوق انھیں دہلی لے آیا۔ یہاں انھوں نے رام پور سہسوان گھرانے کے مشہور و معروف موسیقار استاد مشتاق حسین خاں کی شاگردی اختیار کی۔ آواز اچھی تھی اور موسیقی سے عشق تھا چنانچہ ٹھمری، دادرا، کجری غزل بہت اچھا گانے لگیں اور صف اول کی گانے والیوں میں شمار ہونے لگا۔

لیکن وہ صرف فنکار نہیں تھیں، فنکاروں کی سرپرست بھی تھیں۔ مشکل ہی سے کوئی گانے بجانے والا ہوگا جو ان کے حلقۂ ارادت میں نہ ہو۔ "راگ رنگ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا کام تھا اچھی موسیقی کو فروغ دینا، فنکاروں کو متعارف کرانا اور ان کی مالی مدد کرنا۔ اپنے گھر پر راگ رنگ کی محفلیں منعقد کرتی تھیں۔ جو فنکار دہلی آیا سمجھ لیجیے کہ نینا دیوی کے یہاں ضرور گائے بجائے گا۔ ان کا دہلی آنا بھی زیادہ تر نینا دیوی کے ذریعے ہوتا تھا۔

انھیں دوردرشن نے میوزک پروڈیوسر بنایا تھا۔ اس طرح ان کے لیے فنکاروں کو دہلی بلانے اور ان کی مالی مدد کرنے کی آسانی پیدا ہو گئی۔ نینا دیوی کا خلوص ان فنکاروں کو ان کے گھر بھی کھینچ بلاتا تھا۔ استاد ولایت خاں کا ستار، استاد امرت خاں کا سربہار، استاد شرافت حسین خاں کا گانا، سدھیشوری دیوی کی ٹھمریاں اور دوسرے بہت سے فنکاروں کا گانا انھی کے گھر پر سنا۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ احمد آباد میں ہندو مسلم فساد ہوا اور اس فساد میں مشہور گائکہ رسولن بائی کا گھر جلا دیا گیا۔ وہ بے گھر ہوئیں تو نینا دیوی انھیں دہلی میں اپنے گھر اٹھا لائیں اور پھر ان کو بسانے کی فکر میں لگ گئیں۔ ایک دن ملاقات ہوئی تو کہنے لگیں ہماری کچھ مدد کر دیجیے۔ ہم نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگیں رسولن بائی کی نواسی کی شادی کی فکر ہے۔ اس کے لیے کوئی لڑکا تلاش کر دیجیے۔

انھوں نے دوردرشن کے لیے بہت سے دلچسپ پروگرام ریکارڈ کیے۔ مثلاً انھوں نے سدھیشوری دیوی اور رسولن بائی کو جگل بندی پر آمادہ کر لیا۔ دونوں کا تعلق بنارس سے تھا چنانچہ دونوں کے درمیان بنارس کے لہجے میں باتیں شروع ہوئیں اور پھر دونوں نے مل کر گانا شروع کیا اور ایک سماں باندھ دیا۔ کئی سال بعد جب دوردرشن والوں سے فرمائش کی گئی کہ وہ پروگرام ایک بار پھر دکھلا دیں تو پتہ چلا کہ اسے تو ختم کر دیا گیا ہے یعنی وہ ٹیپ مسترد کیا جا چکا ہے؟ پوچھا کوئی وجہ؟ معلوم ہوا کہ لائبریری میں جگہ کم پڑ گئی تھیں۔

نینا دیوی تصوف سے بہت متاثر تھیں۔ چنانچہ اپنے استاد کے گھرانے کے لوگوں کی طرح وہ بھی بریلی کے "حضرت صابر میاں" کے مزار پر حاضری ضرور دیتی تھیں۔ استاد مشتاق حسین خاں بیمار ہوئے تو آخری دم تک ان کی تیمارداری میں مصروف رہیں اور وہ بستر علالت سے ان کو گانے کے رموز بتلاتے رہے۔

میں دہلی چھوڑ کر آ گیا۔ پھر سنا نینا دیوی چل بسیں۔ معلوم نہیں اب دہلی میں موسیقی اور موسیقی کے استادوں کی خاطر مدارت کرنے والا کوئی بچا کہ نہیں۔

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرض اولیں ہے۔

اردو خبرنامہ

حیدرآباد میں مخدوم محی الدین پر سیمینار

● حیدرآباد، 10 نومبر۔ مخدوم محی الدین کی زندگی انسانیت کی فلاح، سماجی مساوات اور اپنے سیاسی مشن کے لیے وقف تھی۔ ہندوستان کے عوام خصوصاً عام آدمی کے درد کو جس طرح انھوں نے محسوس کیا وہ ایک ایماندار انسان ہی کرسکتا تھا۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مملکت برائے انسانی وسائل (شعبۂ اعلیٰ تعلیم) شریمتی ڈی پورن دیسوری نے این آر آئی ہاؤس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت منعقد مخدوم پر 2 روزہ سیمینار کے دوران اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔

انھوں نے کہا کہ مخدوم کا ترانہ آج بھی نوجوانوں اور عوام کی آواز بنا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں مخدوم کے مطبوعہ کلام ''سرخ سویرا'' (1944) اور ''گلِ تر (1961) کا ذکر بھی کیا اور اس پہلو پر خاص زور دیا کہ گلوبلائزیشن کے دور میں ہندوستانی زبانوں کو جس طرح نظر انداز کیا جارہا ہے وہ ملک کی ثقافتی تاریخ و روایت کے لیے بہت خطرناک ہے۔ بہار سرکار کے سابق وزیر اقلیتی فلاح و بہبود اور پی ڈبلیو ڈی، پروفیسر لطف الرحمٰن نے کلیدی خطبے میں مخدوم کو ایک منفرد اسلوب اور لب و لہجہ کا شاعر بتا کر خراج تحسین پیش کیا۔ مخدوم کے اس شعر کے حوالے سے کہ:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

انھوں نے شاعر کی تخلیقی آفاقیت اور فنی ابدیت کی نشاندہی کی اور کہا کہ ان کی شاعری عوامی نیز جمہوری اقدار کی وراثت ہے۔ افتتاحی جلسے کی نظامت مخدوم کے بیٹے نصرت محی الدین کررہے تھے جب کہ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اردو کے فروغ کے تئیں کونسل کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ریاستی سرکار سے ضمنی شاخوں کے قیام کے لیے زمین الاٹ کرنے کے ضمن میں تعاون کی اپیل کی۔ ڈاکٹر علی جاوید نے انقلابی شاعر کو اس کی سرزمین پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان کے خوابوں کے شہر میں یہ عہد کرنا چاہیے کہ ایک ادیب، ایک شاعر اور ایک کارکن کا رول کیا ہونا چاہیے۔ یہ سیمینار قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔

سیمینار کے پہلے اور دوسرے اجلاس میں پروفیسر لطف الرحمٰن پروفیسر رش اختر، پروفیسر ظہور الدین، ڈاکٹر خالد سعید، ڈاکٹر شہناز انجم اور ڈاکٹر شہناز نبی نے اپنے مقالے پڑھے۔ کولکاتا یونیورسٹی شعبۂ اردو کی ڈاکٹر شہناز نبی نے بنگال کے شاعر انقلاب کی نظم ''وِدروہی'' اور مخدوم کی نظم ''باغی'' کا تقابلی تجزیہ پیش کیا جب کہ جامعہ ملیہ کی ڈاکٹر شہناز انجم نے مخدوم کے تصور انقلاب پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر لئیق صلاح بہ وجہ علالت شامل نہیں ہوسکیں۔ تاہم ان کا مقالہ مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے فیروز عالم نے پیش کیا۔ سیمینار میں حیدرآباد کے علاوہ بہار، دہلی، کولکاتا، جموں کی ادبی شخصیتوں نے حصہ لیا۔ اردو کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین، افسانہ نگار قمر جمالی، شمیم حنفی، زبیر رضوی، علی ظہیر، محمد عباس انصاری، راشٹریہ سہارا دہلی کی فرحت رضوی و دیگر موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد، 11 نومبر۔ نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام مخدوم محی الدین اور جدید انقلابی شاعری میں ان کے مقام سے متعلق دو روزہ سیمینار آج اختتام پذیر ہوا۔ اختتامی اجلاس میں کامریڈ شمیم فیضی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مخدوم نے فاشزم کے خلاف جو نظم جنگ لکھی دراصل وہ فاشزم کے خلاف اردو کی پہلی نظم بھی ہے اور اس کا انکشاف سجاد ظہیر نے بہت پہلے کیا تھا۔ انھوں نے مخدوم کی جدوجہد آزادی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ان کے احتجاجی رویوں نیز تخلیقی عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ان کے سوسالہ جشن کی شروعات کے سلسلے میں ان کا ارادہ 4 فروری کو (مخدوم کا یوم ولادت) دہلی سے کرنے کا تھا لیکن اس سے قبل اس سلسلے کی شروعات شاعر کے آبائی وطن سے کونسل نے کردی ہے۔ واضح ہو کہ اختتامی اجلاس میں محض ایک مقالہ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر بیگ احساس نے پیش کیا۔ علاوہ ازیں یہ اجلاس مکمل طور پر تاثراتی تھا۔ مخدوم سے قربت رکھنے والوں، ان کے دوستوں یا ان کے چاہنے والوں مثلاً اودھیش رانی گوڑ، معروف شاعر حمایت اللہ اور اقبال توصیفی نے اپنی یادوں کے جھروکے سے کچھ نایاب لمحات و واقعات کا ذکر کیا۔ مخدوم کے قریبی دوست راج بہادر گوڑ اگرچہ علالت کی وجہ سے نہیں آسکے تاہم ان کی بہن اودھیش رانی نے دوران تحریک مخدوم کے انڈر گراؤنڈ رہنے سے متعلق کئی واقعات سنائے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مخدوم ایک بزلہ سنج انسان تھے۔ انھوں نے جمال الدین نام کے ایک کردار کو گڑھا جس نام سے بہت سے لطائف دوستوں کی پرلطف محفلوں

میں اکثر سناتے تھے۔ حمایت اللہ نے بھی اپنی تاثراتی تقریر میں ذاتی ملاقاتوں کا ذکر کر کے شاعر کی نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ آخر میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مستقبل میں مخدوم سے متعلق ہونے والے پروگرام سے بھی آگاہ کیا۔

واضح ہو کہ اختتامی اجلاس سے قبل پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر شمین اختر کی صدارت میں دہلی کے زبیر رضوی، حیدرآباد کے یوسف سرمست، علی ظہیر اور مجتبیٰ حسین نے اپنے مقالے پیش کیے۔ زبیر رضوی نے اپنے مقالے میں پکاسو کی مصوری کا حوالہ دیتے ہوئے اور بین الاقوامی سطح پر احتجاجی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے مخدوم کی نظموں کے حوالے سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اپنے ہم عصر شاعروں کے مقابلے میں مخدوم سیاسی محاذ پر بہت فعال تھے اس لیے ان کی شاعری محض ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے بہت آگے ہے۔ وہ انقلاب، نیز حسن وعشق کے شاعر ہیں۔ زبیر رضوی نے ناقدین کے اس رویے پر تشویش کا اظہار کیا کہ شاعری کی تنقید وتفہیم کے معاملے میں لوگوں کی رائے غزل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور نظم کے تئیں بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ پروفیسر یوسف سرمست نے زبیر رضوی کی اس بات پر نااتفاقی کا اظہار کیا کہ مخدوم کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا'' پھیکا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کی نظم ''یہ جنگ ہے جنگ آزادی'' بہت مقبول ہوئی۔ ترقی پسندوں کے ہر اجلاس میں اسے گایا جاتا تھا اور اس کا مقام کسی دوسرے شاعر کی نظم نہیں لے سکی۔ علی ظہیر نے ''جدیدیت اور مخدوم'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں صاف کرنا چاہا کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا تقابلی تجزیہ کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ایک رجحان کا تعلق مقصد سے ہے اور دوسرے کا اظہار سے۔ انھوں نے پکاسو کی مصوری کے حوالے سے عالمی سطح پر احتجاجی رجحانات اور جدید رویوں کا ذکر کیا۔ علی ظہیر نے کہا کہ ''سرخ سویرا'' میں شاعر ایک نئی سمت، نئے لہجے کی تلاش میں کوشاں ہے اور خود انھیں اپنی تخلیقی تبدیلیوں کا احساس تھا اور یہ احساس ''گل تر'' میں واضح ہو گیا۔ مجتبیٰ حسین نے مخدوم کو اپنا آئیڈیل بتاتے ہوئے انھیں خراج پیش کیا اور اپنا وہ خاکہ پیش کیا جو انھوں نے مخدوم کے انتقال کے بعد لکھا تھا۔ اپنے طنز ومزاح سے سامعین کو ہنساتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ مخدوم نے شاعری کی ابتدا جس نظم سے کی وہ ایک پیروڈی تھی۔ انھوں نے مخدوم سے متعلق کئی ذاتی ملاقاتوں اور واقعات سے سامعین کو روشناس کرایا۔ مجلس صدارت کے اراکین پروفیسر شمین اختر اور پروفیسر سیدہ جعفر نے اجلاس کے آخر میں مخدوم کو خراج تحسین پیش کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مولانا آزاد کی یاد میں

● نئی دہلی، 11 نومبر۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اردو سے اٹوٹ رشتہ تھا۔ مولانا نے ملک کی آزادی میں اپنے اردو اخبارات سے جو کام لیا وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اگر آج کچھ لوگ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بتا کر سیاست کر رہے ہیں تو یہ ان کی کج فہمی ہے۔ یہ باتیں آج کانگریس کی سینئر لیڈر محسنہ قدوائی نے کہیں۔ وہ آل انڈیا اردو ایجوکیشن کمیٹی، حیدرآباد کے زیر اہتمام یہاں آندھرا بھون، نئی دہلی میں مولانا آزاد کے یوم پیدائش پر منعقدہ پروگرام سے خطاب کر رہی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد صرف ایک طبقے کی نہیں بلکہ پورے ملک کی نمائندگی کرتے تھے اور انھوں نے آزاد بھارت کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جو تعلیمی اصلاحات کیں اس کے صلے میں ان کے شایان شان ہے کہ ان کے یوم پیدائش کو ''نیشنل اوپن ایجوکیشن ڈے تقریبات'' کے طور پر منایا جائے۔ محترمہ محسنہ قدوائی نے اردو کے تعلق سے کہا کہ آزادی میں اردو کا بہت بڑا رول رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے نئے سرے سے اردو کی ترقی کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان اگر تعلیمی اور اقتصادی طور پر پسماندہ رہیں گے تو اس سے ملک کی ترقی کی رفتار بھی سست رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ مرکز نے انھیں وجوہات کی بنا پر سچر کمیٹی کی تشکیل کی اور آج جب مرکز اقلیتوں سے متعلق اسکیموں پر ریاستوں سے نفاذ کی بات کرتا ہے تو کچھ ریاستیں اسے سیاست کا جامہ پہنا دیتی ہیں۔ محمد جلیل پاشا نے اس موقع پر کہا کہ آل انڈیا اردو ایجوکیشن کمیٹی تقریباً چار دہائیوں سے اردو کی ترقی کے لیے قومی پالیسی کے قیام کا مطالبہ کرتی رہی ہے، لیکن ابھی تک اردو کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جو اسے ملنا چاہیے، تاہم انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی، اقلیتوں کو ترقی کی صف میں کھڑا کرنے اور مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو قومی سطح پر ایجوکیشن ڈے اعلان کرنے کے لیے مرکزی وزیر ارجن سنگھ نے کمیٹی کو جو یقین دہانیاں کرائی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے بہار حکومت کے ذریعے مولانا آزاد کے یوم پیدائش پر ''شکشا دیوس'' منانے کے اعلان کو بھی سراہا۔ انھوں نے اردو کی ترقی کے لیے میڈیا سے بھی تعاون کی اپیل کی۔ مسٹر جلیل پاشا نے اس سلسلے میں محسنہ قدوائی سے تعاون کی درخواست کی، جسے محترمہ محسنہ قدوائی نے قبول کیا۔ آل انڈیا اردو ایجوکیشن کمیٹی، حیدرآباد کی جانب سے مرکزی حکومت سے 26 نکاتی مطالبات پر مشتمل قرارداد سید شریف الحسن نقوی نے حاضرین کو پڑھ کر سنائی جسے ہاتھ اٹھا کر لوگوں نے منظور کیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● حیدرآباد، 10 نومبر۔ صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام تقاریب یوم تعلیم (یوم پیدائش مولانا ابوالکلام آزاد) کے ضمن میں بین المدارس، بین الکلیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت چلنے والے کمپیوٹر سنٹرز اردو ڈپلوما سنٹرز، فنکشنل عربی ڈپلوما سنٹرز اور کئی دینی مدارس میں مولانا آزاد کی زندگی اور کارناموں پر مشتمل کوئیز کے مقابلے منعقد ہوئے اس موقع پر ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی سپروائزر صمدانی کمپیوٹر سنٹر نے کوئیز میں حصہ لینے والے طلبہ وطالبات کو اصول وضوابط سے واقف کراتے ہوئے کہا کہ اس عظیم رہنما کی مجاہدانہ زندگی اور ملک وملت کے لیے کبھی نہ فراموش ہونے والے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنا چاہیے۔ مولانا نے اپنی قیمتی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہندوستانی قوم کی امانت سمجھ کر آزادی کی تحریک وجدوجہد میں لگادیا۔ انورالدین صدیقی انچارج کمپیوٹر سنٹرز نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے زبان و قلم کی طاقت سے مولانا آزاد کو نوازا، مولانا خلیل احمد ندوی نظامی نے مولانا آزاد کی زندگی اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور نوجوانوں سے خواہش کی کہ مولانا آزاد جو محسن قوم ہیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں ایک نمائش ترتیب دی جارہی ہے جس میں مولانا آزادی کی ابتدائی زندگی، خاندانی حالات، علمی شغف، صحافت، ملک وملت کی خدمت، کانگریس پارٹی کے صدر کی حیثیت سے مولانا کے کارنامے عالمی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کا سامنا، اسلامی ورثے کی قدر اپنے مسلمان ہونے پر فخر، متحدہ قومیت کے لیے مولانا کی انتھک کوششیں، تقسیم ہند کی آخری لمحے تک مخالفت، دس سال سات ماہ تک جیل کی مشقتیں برداشت کرنا، تحریک خلافت، ہندوستان چھوڑ دتحریک، انفرادی ستیہ گرہ وغیرہ میں ثابت قدمی کے ساتھ قوم کی مکمل رہنمائی، وزیر تعلیم کی حیثیت سے ہندوستان میں موجودہ تعلیمی ترقی کی بنیاد میں مضبوطی پیدا کرنا اور پروان چڑھانا ان تمام چیزوں کے ساتھ قیمتی نایاب مطبوعات اور شاہکار تصانیف پر مشتمل یہ نمائش ہر لحاظ سے طلبہ کے لیے مفید ہوگی۔ توفیق احمد صدیقی کنوینر نے کوئیز مقابلوں کے نتائج کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ بین المدارس مقابلوں میں براہم ہائی اسکول کی ٹیم نے انعام اول اور حیدرآباد کا نونٹ اسکول نے انعام دوم حاصل کیا۔ کمپیوٹر سنٹرز مقابلوں میں محبوب حسین جگر سنٹر نے اول اور صمدانی کمپیوٹرز نے دوم کامیابی حاصل کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● دربھنگہ، 13 نومبر۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے تحت چل رہے۔ کالج آف ٹیچرز ایجوکیشن (بی ایڈ) الیاس اشرف نگر چندن پٹی لہریا سرائے دربھنگہ میں یوم تعلیم کے طور پر منایا گیا۔ اس موقع پر کالج کے طلبہ وطالبات کے درمیان تقریری اور تحریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا کالج کے پرنسپل اے آر خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ تعلیمی شعبے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کارکردگی حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا آزاد نے ملک کی جنگ آزادی میں جو خدمات انجام دیں وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کو یوم تعلیم کے طور پر منانے کا ریاستی حکومت کا فیصلہ لائق ستائش اور مرکزی و دیگر ریاستی حکومتوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ مسٹر خاں نے مزید کہا کہ یہ نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ اب تک کی تمام مرکزی حکومتوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بھارت رتن ایوارڈ سے نہیں نوازا جبکہ ملک کی جنگ آزادی میں ان کی خدمات کو ہم فراموش نہیں کرسکتے۔ مولانا آزاد نے جنگ آزادی میں اپنی سرگرمیوں سے انگریزوں کے حوصلے کو پوری طرح پست کردیا تھا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مولانا آزاد کی زندگی سے سبق سیکھیں اور تعلیمی شعبے میں ان کی کارکردگی کو اپنی عملی زندگی میں اتار کر کامیابی کی منزلیں طے کریں۔ اس موقع پر کالج کے طلبہ وطالبات نے اپنی تقاریر میں مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ زیادہ تر طلبہ وطالبات نے مولانا آزاد کی سیاسی دور اندیشی اور صحافتی اوراک کو مطمح نظر بنا کر تقاریر کیں۔ ان کی تقاریر کا مرکز مولانا کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' تھی چند مقررین نے مولانا کے مکتوبات کے مجموعے ''غبار خاطر'' کی روشنی میں ان کی نثری خصوصیات کو واضح کیا۔

کالج کے اساتذۂ کرام محمد فیض، طالب اطہر، سرمد جمال، شفاعت علی، توقیر امام اور محترمہ کشور واحد نے مقررین کی تقاریر اور ان کے گہرے مطالعے کی تعریف کی اور طالبہ صافیہ امام کی نظامت کی ستائش کی۔ اختتام کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر صداقت علی خاں کے ہدیۂ تشکر پر ہوا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● ناگپور۔ نوجوانوں اور طالب علموں کی فعال ومتحرک تنظیم یونائیٹڈ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن، مومن پورہ، ناگپور کے زیر اہتمام ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش کے موقع پر ہر سال ریاستی سطح پر طلبہ کے لیے مقابلۂ مضمون نویسی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس مقابلے کا مقصد طلبہ اور طالبات کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور ان میں تحریری صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ امسال اس مقابلے کا عنوان ہائی اسکول گروپ کے طلبہ وطالبات کے لیے ''حفظان صحت کے اصول'' اور جونیئر کالج گروپ کے طلبہ وطالبات کے لیے ''صحت کی اہمیت و افادیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں'' تھا۔ اس مقابلے میں ریاست کے متعدد ہائی اسکولوں اور جونیئر کالجوں سے کل 675 طلبہ وطالبات شریک مقابلہ ہوئے۔ جس میں ہائی اسکول گروپ سے کاریگر صبا

جہاں عبدالرزاق (اینگلو اردو گرلس ہائی اسکول، پونے) کو اول، سید ذیشان علی سید رفیق علی (حسامیہ بوائز ہائی اسکول، شانتی نگر، ناگپور) کو دوم اور زاہد احمد عبدالرشید قریشی (مہاتما جیوتی باپھلے اردو، تیلگو ودیالیہ بلار پور، ضلع چندر پور) کو سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ جونیئر کالج گروپ سے نورالصباح بنت علیم خان (اردو ادھیاپک ودھیالیہ، ڈی ایڈ کالج، نیو ایئر کھیڑا، کامٹی) کو اول، گوہر افشاں محمد اعجاز انصاری (بیگم قمرالنساء کاریگر ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج، شولاپور) کو دوم اور محمد فراز احمد ابن محمد کلیم یزدانی (شری شیواجی نائٹ ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج، کھدان، ناگپور) کو سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ شریک مقابلہ تمام طلبہ و طالبات کو اسناد سے نوازا جائے گا اور اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ و طالبات کو تنظیم کے 17 ویں سالانہ اجلاس میں مورخہ 22 فروری 2008 کو انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔ یہ اطلاع ایک پریس نوٹ میں تنظیم کے صدر جاوید انصاری نے دی ہے۔ (ڈاک سے)

علامہ اقبال کو خراج عقیدت

● علی گڑھ، علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے وسیلے سے دنیا بھر کے مظلومین کو جو پیغام دیا ہے وہ آج بھی زندہ ہے۔ یہ خیال آج یہاں شاعر مشرق کے 130 ویں یوم پیدائش کے موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پالی ٹیکنک میں ''یوم اردو'' کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر وی کے عبدالجلیل نے ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ مفکر، فلسفی، ماہر لسانیات اور سچے محب وطن تھے۔ پروفیسر جلیل نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ملک کی تقسیم نے زبانوں کو بھی تقسیم کر دیا جبکہ اردو ہندی کا رشتہ نہ صرف قدیم ہے بلکہ کافی مضبوط بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دور حاضر میں اردو کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

پروفیسر ایمریٹس پروفیسر فرحت اللہ خان نے کہا کہ اردو زبان ہندوستانی ثقافت کی وراثت ہے اور اس کے تحفظ کی ذمے داری سبھی پر ہے اور علامہ اقبال کی شاعری تمام انسانیت کی میراث ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نے کہا کہ اردو جن علاقوں اتر پردیش و بہار میں پلی آج وہاں سب سے زیادہ نظر انداز کی جارہی ہے جبکہ مہاراشٹر جیسے صوبوں میں بڑی تعداد میں طلبہ اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج پھر ایک نئے اقبال کی ضرورت ہے جو لوگوں کو احساس کمتری سے نکال کر انھیں سر اونچا کر کے جینا سکھا سکے۔

تقریب کے اعزازی مہمان مسٹر ضمیر اللہ نے کہا کہ اردو زبان کے زوال کے لیے ہم بھی ذمے دار ہیں۔ کیونکہ ہم نے اس کو پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اردو زبان کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ شہر کے رکن اسمبلی نے اے ایم یو اور شہر کے درمیانی رشتوں کو مزید مضبوط بنائے جانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے شہر میں غریب بچوں کے لیے یونیورسٹی کی انتظامیہ سے ایوننگ اسکول چلائے جانے کی اپیل کی۔

حاضرین کا خیر مقدم پالی ٹیکنک کے پرنسپل پروفیسر ایس اقبال علی نے کیا جبکہ ویمنس پالی ٹیکنک کے پرنسپل پروفیسر شمیم احمد نے کہا کہ اے ایم یو کی مارکس شیٹ میں اردو پیپر کے نمبروں کو بھی جوڑا جانا چاہیے تا کہ طلبہ سنجیدگی کے ساتھ اردو کی پڑھائی کر سکیں۔ انھوں نے اردو میڈیم کے مزید اسکول کھولنے اور اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کا مطالبہ کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر الیاس نوید اور شکریہ ایس عابد حسین نے ادا کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

● آگرہ، 8 نومبر۔ علامہ اقبال کا یوم پیدائش یہاں یوم اردو کے طور پر منایا گیا۔ اس موقع پر مختلف تنظیموں نے اردو تعلیم و ادب کے سلسلے میں مختلف پروگرام منعقد کیے۔ مرزا غالب ریسرچ اکادمی کے دفتر میں منعقدہ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے شہر قاضی سید محمد صابر مجددی نے کہا کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مسلم قوم، مدارس اور جدید تعلیم سے متعلق جو اشارے کیے وہ سچ ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کی وہ حقدار تھی۔ اسرار اکبرآبادی نے کہا کہ آج عوام میں اردو زبان کا مفہوم محض عاشقانہ شعر و شاعری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ میڈیا، سیاست اور ہمارے نام نہاد مجاہدین اردو نے اردو کے فروغ کی بجائے اسے ایک خاص طبقے تک محدود کر کے رکھ دیا۔ احمر جلیسری نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنے بچوں کو اسکول میں ایک زبان کی حیثیت سے اردو زبان ضرور پڑھوانا چاہیے۔ نظامت ڈاکٹر سید افتخار جعفری نے کی، اس کے بعد ایک شعری نشست ہوئی۔ اردو ٹیچرز ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر نظام الدین سیفی کی صدارت میں ایک مختصر اجلاس بی ایس اے دفتر میں منعقد ہوا جس میں آگرہ میں اردو تعلیم کی زبوں حالی پر تشویش ظاہر کی گئی۔ جلسے میں شریک اردو ٹیچرز نے اس بات کا شکوہ کیا کہ بیشتر اسکولوں میں جہاں اردو ٹیچر مقرر ہیں وہاں اردو کی کتابیں نہیں مل پارہی ہیں۔ آگرہ میں اردو میں امتحان دینے کی سہولت بھی حاصل نہیں ہے۔ جونیئر ہائی اسکول گڑھی بھجے شمس آباد میں اردو کی کتابیں ایسوسی ایشن کی طرف سے تقسیم کی گئیں۔ اطہر، محمد مختار، نوشاد احمد، عبدالحئی، شکور احمد، اسلم بیگ، شمشاد خان، بابو لال، افروز ناظم اور شمس الحسن وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ بزم میکش کی جانب سے ایوان میکش میں ایک مجلس

منعقد ہوئی جس کی صدارت سید اجمل علی شاہ نے کی۔ بزم سخن نما کی جانب سے ایک شعری نشست کا انعقاد شہید نگر میں کیا گیا۔ اس کے علاوہ شعیب محمد یہ کالج، صغیر فاطمہ گرلز کالج، سینٹ علی پبلک اسکول وغیرہ میں بھی یوم اقبال منانے کی خبریں موصول ہوئی ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 10 نومبر۔ ہندوستان ایکسپریس نیوز بیورو: شاعر مشرق علامہ اقبال کے بغیر اردو شاعری و ادب نامکمل ہے۔ ان خیالات کا اظہار چیئرمین برائے اقلیتی تعلیمی انسٹی ٹیوشنز جسٹس محمد سہیل اعجازی نے کیا۔ وہ علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی یوم اردو کانفرنس میں بطور مہمان خصوصی اپنے تاثرات پیش کررہے تھے۔ مسٹر اعجازی نے اپنے ہاتھوں سے سعید سہروردی کو برائے صحافت، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو برائے ادب، ابومسعود اظہر غوری کو برائے تصنیف و تالیف، پروفیسر محمد حسن کو برائے تنقید و تخلیق، مولانا عاصم امروہوی کو برائے خطاطی، بحر العلوم کو اردو رتن ایوارڈ، حکیم امام الدین ذکائی کو برائے طب ایوارڈ دیے۔ اسکولی طلبہ و طالبات کو بھی انعامات و اسناد سے سرفراز کیا گیا۔ مسٹر اعجازی نے اس موقع پر مزید کہا کہ علامہ اقبال کو پڑھنا آسان اور سمجھنا مشکل ہے۔ ان کے فکر و فلسفے کو سمجھنے کے لیے ایک عمر کی ضرورت ہے۔ وہ وقت گزاری کے لیے پڑھے جانے والے شاعروں میں سے نہیں ہیں۔ انھوں نے اردو کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یو این او کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں بولی جانے والی چینی زبان پہلی اور اردو دوسری زبان ہے۔ سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ ماہرین کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اقبال اور غالب کے مطالعے کے بغیر کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔ جس کو اپنا اقدار اونچا کرنا ہو وہ اقبال کا مطالعہ کرے۔ انھوں نے کہا کہ روس جیسے ملک میں اقبال پر اب تک 23 کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور 21 کتابیں عربی زبان میں لکھی جاچکی ہیں۔ یہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ آج ہم پہلی جنگ آزادی 1857 کا جشن منارہے ہیں۔ یہ آزادی کی تحریک اردو زبان کے ذریعے شروع ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ 20 ہزار دستاویزات آج بھی نیشنل آرکائیو میں موجود ہیں جو اردو اور فارسی میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسئلہ زبان کو زندہ رکھنے کا نہیں ہے بلکہ رسم الخط کو باقی رکھنے کا ہے جو دن بہ دن محدود ہوتا جارہا ہے۔ سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے کہا کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ حالی ماضی کے شاعر تھے، اکبر الہ آبادی حال کے اور علامہ اقبال مستقبل کے شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود اقبال کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ اقبال کا شروع سے شکوہ تھا کہ مسلمانوں میں علم کی کمی ہے اور آج یہی بات دوسرے لوگ کہہ رہے ہیں۔ صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت وصی احمد نعمانی ایڈوکیٹ نے کی۔ اس موقع پر عالمی یوم اردو آرگنائزیشن کمیٹی نئی دہلی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں اور معاون کنوینر سہیل انجم، حکیم محمد طارق امروہوی وغیرہ نے پروگرام کو کامیاب بنایا۔ پروگرام میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور اپنی اردو دوستی کا ثبوت پیش کیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

● سہارنپور، 10 نومبر۔ اردو ہماری ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے اور دنیا کے ہر ملک میں اس کے جاننے والے موجود ہیں۔ آج ملک میں ایک مخصوص طبقہ صرف اپنی ذاتی منفعت کے لیے اردو کی مخالفت کرتا ہے حالانکہ وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملک میں اردو ہی وہ طاقت ہے جس نے تمام ملک کو ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو ٹیچر ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر راؤ عبدالستار نے کیا۔ موصوف آج یہاں محلہ شاہ مدار میں نعیم طالب کو اسٹیٹ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ کے لیے منتخب ہونے پر ان کے اعزاز میں منعقد تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ 9 نومبر کو علامہ اقبال کا یوم پیدائش تھا اور ایسوسی ایشن نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر سال اسی دن کو یوم اردو کے طور پر منایا جائے اور اس دن اردو کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے والے افراد کو علامہ اقبال ایوارڈ سے نوازا جائے۔ انھوں نے کہا کہ نعیم طالب نئی نسل کے ٹیچروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے وہاں پر جمع تمام لوگوں سے اپیل کی کہ اگر اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اپنے ہر بچے کو اردو پڑھائیں۔ ہارون حسرت دیوبندی نے کہا کہ ہم اردو کے کتنے بڑے قدرداں ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے گھروں میں کتنے بچے اردو سے واقف ہیں۔ ڈاکٹر شمین زبیری نے کہا کہ اگر ہم واقعی اردو سے بھی محبت کرتے ہیں تو ہمیں اپنے محلوں میں اردو سیکھنے کے مراکز قائم کرنے ہوں گے۔ زبان وہی زندہ رہتی ہے جس کے جاننے والے اور سمجھنے والے موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں تعلیم دلوانی چاہیے جہاں پر اردو بھی سکھائی جاتی ہو۔ انھوں نے نعیم طالب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ان کا ایوارڈ کے لیے منتخب ہونا ہم سب کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ ڈاکٹر عثمان الحق صدیقی نے اشعار کے ذریعے اردو کی قدردانی کی طرف توجہ دلائی۔ اس موقع پر نعیم طالب کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی ان کی اردو میں نمایاں خدمات کے لیے علامہ اقبال ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان میں محترمہ کہکشاں، ناہید صاحبہ، محترمہ مبینہ، تسلیم احمد، محمد اسلم، شفیق احمد، جاوید انور، حکیم الدین، محمد اکبر،

شاہد علی خاں، ندیم اختر، شرافت علی، ضیا، جنید خاں، ضیا، ڈاکٹر شاہد زبیری، محمد صالح، ہارون رشید شامل تھے۔ پروگرام کی صدارت ممتاز مجاہد آزادی ظہور احمد ظہور نے کی جب کہ نعیم پیرزادہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔
(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، مظفرنگر انوادک کرمچاری سنگھ کے زیر اہتمام شاعر مشرق علامہ اقبال کی یوم پیدائش کے موقع پر کل یوم اردو کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت شہر قاضی ظہیر عالم نے کی۔ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے تنظیم کے منتظمین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ایسے پروگرام ہر جگہ منعقد ہونے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے گھروں میں اردو کے رسالے اور اردو کے اخبارات پڑھے جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں اس مادری زبان کو بالکل ہی بھول جائیں۔ اردو انوادک کرمچاری سنگھ کے نائب صوبائی صدر تحسین علی نے کہا کہ اردو زبان کی حلاوت اور شیرینی سے کون واقف نہیں لیکن اس کے باوجود آج اردو زبان کے ساتھ سرکاری و غیر سرکاری طور پر ناروا سلوک کیا جارہا ہے۔ اردو کو ختم کرنے میں جہاں اردو مخالف ذہن کی سازش ہے وہیں ہم اردو والے بھی کم ذمے دار نہیں ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو داں عوام روزمرہ کے کاموں میں اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ضلع صدر کلیم احمد نے محبان اردو سے اپیل کی کہ اتر پردیش میں اردو سرکاری زبان ہے اس لیے تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں درخواستیں دینے میں جھجک محسوس نہ کریں۔ تمام بینکوں میں اردو میں بھرے ہوئے چیک موصول کیے جائیں گے اس لیے اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں جس سے اردو کا فروغ ہو۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● سری نگر، گریٹر کشمیر فاؤنڈیشن آرگنائزیشن نے اقبال کی شاعری پر آج یہاں ایک روزہ سیمینار کا اہتمام کیا۔ ''آج کی دنیا میں اقبال کی شاعری کی اہمیت'' کے موضوع پر منعقدہ اس سیمینار میں کشمیر کے کئی معروف اسکالروں نے شرکت کی۔ ایم ایل سی محمد یوسف ٹینگ نے اقبال کی شاعری میں کشمیری عوام کی ذہنیت کے تاثرات پر اور غلام نبی خیال نے کشمیر کے تعلق سے اقبال کے سیاسی نظریات پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر بی اے نگھوی نے اقبال کے قومی نظریے جب کہ ڈاکٹر مشتاق غنی نے ایک فلسفی کی حیثیت سے اقبال کے رتبے کے موضوع پر تقریریں کیں۔ اس سیمینار کے دیگر اہم شرکا میں ش م احمد پروفیسر عبداللہ شاہ اور پروفیسر جی آر ملک شامل تھے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

● حسن پور: حسن پور میں یوم اقبال اردو اکادمی کے عبداللہ ہال میں منایا گیا جہاں علمائے دین کے علاوہ سیاسی وسماجی لوگوں نے بھی حصہ لیا۔ اس موقع پر مولانا تبارک علی مظاہری نے کہا کہ علامہ اقبال ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک فلسفی ایک مفکر اسلام اور سچے محب وطن بھی تھے۔ اس تقریب میں مولانا ظہیر احمد قاسمی، مولانا آفاق احمد سرہندی، مولانا انیس الرحمٰن برکاتی، مولانا سراج الدین قادری، محمد وکیل احمد ایڈووکیٹ، حسیب احمد خان نے بھی حصہ لیا۔

اردو اور ہندی نثر پر انقلاب 1857 کے اثرات اور ردعمل

● نئی دہلی، 6 نومبر۔ 1857 کا انقلاب 19 ویں صدی کی سب سے بڑی تحریک تھی جس میں عوام نے مسلح ہوکر سامراجیت کے خلاف لڑائی لڑی۔ اس تحریک کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس میں خواتین بھی لیڈر کے طور پر شامل رہیں۔ 1857 کے انقلاب کے اردو اور ہندی نثر پر کافی اثرات مرتب ہوئے۔ ان خیالات کا اظہار آج نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقدہ گولڈن جوبلی سیمینار بعنوان ''اردو اور ہندی نثر پر 1857 انقلاب کے اثرات اور ردعمل'' کے افتتاحی اجلاس کے دوران مقررین نے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت شمس اقبال نے کی۔ اس موقع پر معروف شاعر مخمور سعیدی کی مرتب کردہ کتاب ''وادیٔ خیال'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریر میں ہندی کے معروف ادیب پروفیسر نامور سنگھ نے کہا کہ 1857 کے انقلاب کی ہندی نثر اور نظم دونوں پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے حالانکہ یہاں صرف نثر کی ہی بات ہوئی ہے۔ نامور سنگھ نے کہا کہ 1857 میں ہندو مسلم اتحاد کی جو مثال قائم ہوئی تھی وہ ایک ریکارڈ ہے۔ میرے نزدیک 1857 کا انقلاب قومی تحریک تھی اور تب جیسی قومی یکجہتی کبھی اور دکھائی نہیں دی۔ انھوں نے ہندی نثر پر انقلاب کے اثرات کے بارے میں تفصیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس انقلاب کے نثر پر گہرے اثرات ہوئے اور ہر ادیب نے اس کو اپنے اپنے انداز سے رقم کیا۔ انھوں نے مثال کے طور پر ناول ''غدر'' اور ''جھانسی کی رانی'' کے علاوہ چترسین شاستری کے ''سونا اور خون'' مہاشویتا دیوی کے ''رانی جھانسی'' پرتاپ نارائن شریواستو کے ''بے کسی کا مزار'' پریم چند کے ''شطرنج کے کھلاڑی'' وغیرہ کا ذکر کیا۔ معروف اردو اسکالر پروفیسر محمد حسن نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں 1857 کی تحریک کو ''غدر'' نہیں مانتا اور یہ ایسی پہلی تحریک تھی جس میں دو۔دو خواتین (رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل) نے لیڈر کے طور پر شرکت کی۔ ایسی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا کہ عوام (سپاہیوں) نے خود بہادر شاہ ظفر کو اپنا لیڈر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو نثر پر 1857 کے بہت بڑے اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے قبل نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کی

ڈاکٹر نزہت حسن نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ سال این بی ٹی کا گولڈن جوبلی سال ہے اور 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ کا جشن بھی منایا جارہا ہے، ایسے میں اس گولڈن جوبلی سیمینار کے انعقاد کا مقصد یہی ہے کہ لوگ 1857 کے انقلاب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکیں۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی جبکہ نظامت دیوشنکر نوین نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر رضوان قیصر، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر کے ڈی شرما نے 1857 کے انقلاب اور اس کے اردو نثر پر اثرات کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی کا صحیح علم ہمیں اردو کی کتابیں پڑھ کر ہی ہوسکتا ہے۔ غالب کے خطوط اور ''دستنبو'' میں بھی اس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ پروفیسر رضوان قیصر نے اردو نثر کے تعلق سے سرسید احمد کی ''اسباب بغاوت ہند'' اور ڈپٹی نذیر احمد کی ''ابن الوقت'' کا بالخصوص تذکرہ کیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مرزا غالب اپنے خطوط میں جو نظر آتے ہیں وہ ''دستنبو'' میں نظر نہیں آتے ہیں اسی طرح سرسید احمد خاں کے تعلق سے بھی جو غلط فہمیاں ہیں وہ سب اس وقت ان کی مجبوریاں تھیں۔ وہاب اشرفی نے کہا کہ 1857 کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلے کی ہندو مسلم تمام تحریکوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا جو اس وقت لکھی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اصل میں یہ انقلاب اچانک ہی برپا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تیاری اور کوشش کافی پہلے سے چل رہی تھی۔ سیمینار میں شرکت کرنے والے اہم افراد میں پربھاش جوشی، منگلیش ڈبرال، اشوک واجپئی، پروفیسر صغریٰ مہدی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، محمور سعیدی، بلراج ورما، شہپر رسول، ڈاکٹر احمد محفوظ، محمد احمد کاظمی، خالد بن سہیل، عمیر منظر، منیجر پانڈے، ملک زادہ جاوید، مولانا عبدالحمید نعمانی، سیماب سلطان پوری، شریف انصاری، عذرا سلطانہ وغیرہ شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''مشاعرے کی روایت: کمال و زوال''
کے عنوان پر دو روزہ سیمینار

● نئی دہلی، 10 نومبر۔ مشاعروں کا زوال نہیں ہوا بلکہ وہ اپنا پیرہن تبدیل کررہے ہیں، ہمیں مشاعروں کی کارکردگی کا جائزہ لینا ہے تو آج کے دور کے سیاق و سباق میں لینا ہوگا اور اس کے لیے پرانے معیار اور میزان کو بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام اردو گھر میں ''مشاعرے کی روایت: کمال و زوال'' کے عنوان سے منعقدہ دو روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ مشاعروں میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اس کے لیے ہمارے دانشوروں اور پروفیسر حضرات کی بے اعتنائی بھی شامل ہے۔ ہر دانشور مشاعروں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑا ہے جبکہ سچ یہ ہے کہ مشاعروں نے ہی زبان و ادب کی تبلیغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج جب ہماری تہذیب اور کلچر سب کچھ بدل رہا ہے تو صرف مشاعروں میں آنے والی تبدیلی پر ہی کیوں اعتراض ہے۔ مشاعروں کے معیار کو پرانے میزان پر کیوں تولا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج آزادی کے 65 سال بعد اس اہم ترین موضوع پر سیمینار منعقد کرنا ایک تاریخی قدم ہے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ مشاعرے کے انسٹی ٹیوشن کو زوال پذیر ہونے سے کیسے روکا جائے۔ اپنی افتتاحی تقریر میں خواجہ حسن ثانی نظامی نے کہا کہ مشاعرے کا ایک بڑا کام معاشرے کی اصلاح کرنا اور اسے تربیت دینا ہے۔ اگر مشاعرے پابندی اور اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتے رہتے تو زبان پر وہ زوال نہ آتا جو آج دیکھنے کو مل رہا ہے۔ مشاعرے کی روایت کی بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو شعر و ادب نے خانقاہوں میں آنکھیں کھولیں اور صوفیوں کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا۔ چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نریش نے کہا کہ آج مشاعرہ جس مقام پر پہنچ گیا ہے وہ ہمارے لیے تشویش کا باعث ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے ایک طرح سے تربیت گاہیں تھیں جہاں جا کر زبان، آداب اور تہذیب وغیرہ سیکھنے کو ملتی تھی لیکن اب لوگ مشاعرہ سننے نہیں دیکھنے آنے لگے ہیں، انھوں نے کہا کہ آج ملک میں زبان کا بھی زوال ہورہا ہے اور یہ کیفیت اردو ہی کی نہیں ہر ہندوستانی زبان کی ہے۔ اس سے قبل اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اردو کی روایت اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مشاعروں کے زوال پذیر ہونے کے اسباب بھی بیان کیے اور کہا کہ مشاعرہ زبان و تہذیب کا شاید سب سے مستحکم، مضبوط اور مختلف جہتیں رکھنے والا ادارہ ہے۔ ہمیں اس ادارے کو زوال سے روکنے کے لیے غور کرنا ہوگا۔ مشاعروں کے گرتے معیار پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج کچھ ایسے شاعر بھی ہیں جو اسٹیج پر تھرکتے ہوئے جسمانی اداؤں کے ساتھ اس طرح شعر ادا کرتے ہیں کہ لکھنؤ کی منڈی کی خواتین تک شرما جائیں۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے انجام دیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعرہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا

● نئی دہلی، 11 نومبر۔ مشاعرہ کا ادارہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج اس ادارے کا استعمال سماجی و معاشرتی اصلاح کے لیے نہ ہوکر

ذاتی مفادات کے لیے ہونے لگا ہے اس کا زبردست استحصال کیا جارہا ہے۔

ان خیالات کا اظہار مقررین نے کیا۔ وہ دہلی اردو اکادمی کی جانب سے اردو گھر میں مشاعرہ کی روایت کمال و زوال پر منعقدہ دو روزہ سیمینار میں اپنے مقالات پیش کررہے تھے۔ فاروق ارگلی نے مشاعرے کے کمال اور زوال پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے ایک طرف سنجیدہ اور ادبی مشاعروں کا ذکر کیا تو دوسری جانب براڈ مشاعروں کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے مشاعرے میں آنے والی تبدیلی کو انقلابی قرار دیا۔ معروف شاعر مخمور سعیدی نے اپنا تاثراتی مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر مظفر حنفی نے تذکروں کا حوالہ دیا اور طرحی مشاعروں کی روایت کا بھی۔ انھوں نے کہا کہ 20ویں صدی کی پانچویں دہائی تک مشاعرہ ہندوستان میں اپنی بلندی پر تھا لیکن اس کے بعد سے اس کا زوال شروع ہوا۔ انھوں نے پیشہ ور شعرا اور شاعرات کا ذکر کرتے ہوئے فراق، حسرت، کیفی، مجروح، علی سردار جعفری وغیرہ کا ذکر کیا جو مشاعروں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ نظامت کرتے ہوئے معین شاداب نے کہا کہ مشاعروں کا ادارہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا ہے اور آج اس کا ذاتی مفاد کے لیے استحصال ہورہا ہے۔ مجلس صدارت میں پروفیسر قمر رئیس، بلراج کومل ڈاکٹر تقی سکندر آبادی، ڈاکٹر فریاد آزر شامل تھے۔ پروفیسر صغریٰ مہدی، پروفیسر نریش، ڈاکٹر حسن مثنٰی اور دیگر لوگوں نے سوال بھی اٹھائے اور کہا کہ اگر مشاعروں میں کچھ خرابیاں آئی ہیں۔ تو ان کو دور کرنے کے لیے منظم کوشش کی جانی چاہیے۔ اردو کے مسائل پر بھی بات کی گئی اور کہا گیا کہ جب اسکول کی سطح پر اردو کو فروغ نہ ملے گا یہ تمام خرابیاں منظر عام پر آتی رہیں گی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

جامعہ کا 87واں یوم تاسیس

● نئی دہلی، 2 نومبر۔ جامعہ کمیونٹی سینٹر و بارات گھر کا افتتاح: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 87ویں یوم تاسیس کے موقع پر منعقد تعلیمی میلے کے آخری دن قرب و جوار اور اطراف کے لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ صبح جامعہ کمیونٹی سینٹر اور بارات گھر کا افتتاح وائس چانسلر کی موجودگی میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے چیئرمین سراج الدین قریشی نے کیا۔ اس موقع پر پروفیسر مشیر الحسن نے بارات گھر کی ضرورت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی سراج الدین قریشی نے وائس چانسلر کے تعلیمی اور تعمیری دونوں کاموں کی تعریف کی اور کہا کہ انھوں نے نہایت کم مدت میں جامعہ کو ظاہری و معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ کردیا ہے۔ مسٹر سراج الدین قریشی نے پیش کش کی کہ اگر مجھے حکم ملے تو میں اس بارات گھر کو ایئر کنڈیشن (AC) کرادوں گا۔

● **قرۃ العین حیدر آرکائیوز اور لائبریری کا قیام:** پروفیسر مشیر الحسن کی کوششوں اور ہما حیدر اور رفیع الحسن کے تعاون سے جامعہ میں قرۃ العین حیدر آرکائیوز اور لائبریری کا قیام اور افتتاح عمل میں آیا۔ پہلے باب قرۃ العین حیدر کا افتتاح اس کے بعد قرۃ العین حیدر کی یاد میں نشست کا اہتمام اور اب ان کے پورے سرمائے کو محفوظ اور یادگار بنانے کا تاریخی عمل۔ قرۃ العین حیدر آرکائیوز کا افتتاح مشہور ہندی کے پروفیسر نامور سنگھ نے کیا۔ لائبریری میں قرۃ العین حیدر کی کتابیں انھیں دیے گئے اعزازات اور ایوارڈ کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی لائبریری کی ساری کتابیں رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے استعمال کی ساری چیزیں لباس، کھانے کے برتن اور دیگر اشیا کو نہایت قرینے اور سلیقے سے رکھا گیا ہے۔ اس جلسے میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر ایم پی شرما، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر زبیر فاروقی، شفیق احمد خاں ندوی، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر عبدالرشید، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر احمد محفوظ، پروفیسر شہباز انجم، ڈاکٹر کوثر مظہری، خالد بن سہیل، ڈاکٹر محمد ارشد، مفتی مشتاق تجاروی، سہیل احمد فاروقی، قرۃ العین حیدر کے اعزہ بطور خاص ہما حیدر اور رفیع الحسن موجود تھے اور جامعہ کے اس اہتمام پر وہ کافی خوش نظر آئے۔

● **قرأت کے مقابلے:** ایڈورڈ سعید ہال میں جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے زیر اہتمام قرأت کے مقابلے کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر بدرالدین الحافظ نے کی جب کہ بطور مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع نے شرکت کی۔ جج کے فرائض پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی اور قاری محمد سلیمان نے انجام دیے اور نظامت کی ذمے داری مزمل قاسمی نے انجام دی۔ مقابلے میں جامعہ کے علاوہ دہلی کے مختلف اسکولوں سے طلبہ نے شرکت کی۔ ہمدرد پبلک اسکول، شاہین پبلک اسکول، ایسندرم اسکول نوئیڈا، ذاکر حسین میموریل اسکول، خدیجۃ الکبریٰ اسکول کے علاوہ دیگر اسکولوں کے طلبہ و طالبات نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔

● **"خواتین اور کام، مواقع اور مسائل" پر مباحثہ:** تعلیمی میلے میں جامعہ گرلز ہاسٹلوں (جی پی ہاسٹل، بیگم انیس قدوائی ہاسٹل اور آصف علی ہاسٹل کی طالبات نے مختلف پروگرام پیش کیے۔ F.TI.CIT ہال میں "خواتین اور کام، مواقع او مسائل" کے موضوع پر ایک مباحثے کا انعقاد کیا گیا۔ مشہور وکیل نندرائے، ماہر تعلیم انشومالا گپتا، فرنٹ لائن میگزین کی مدیر کے راجالکشمی نے جج کے فرائض انجام دیے۔ مباحثے میں پہلا انعام رانی روشی، دوسرا دیپا مریم

ورگس اور تیسرا انعام محمد سلطان نے حاصل کیا۔ یہ انعامات پروفیسر شگفتہ کاک اور پرووسٹ کیرئیر ہوسٹل ڈاکٹر وحیدہ خاں کے ذریعے تقسیم کیے گئے۔

● **گیت اور موسیقی کے مقابلے:** جامعہ کے اوپن تھیٹر میں "گیت اور موسیقی کے مقابلے" کے عنوان سے پروگرام منعقد ہوا۔ پروگرام میں 19 بچوں نے حصہ لیا۔ جج کے فرائض نیاز فاطمہ اور ریچے مشرا نے انجام دیے۔ پہلا انعام ثریا، دوسرا مونیکا اور تیسرا انعام تچن نے حاصل کیا۔ یہ انعامات جسٹس سردار علی مہمان خصوصی کے ہاتھوں دیے گئے۔ اس موقع پر عذرا خورشید، پروفیسر شہناز انجم، رچا گپتا، آرتی راٹھور اور سعدیہ انصاری موجود تھیں۔

● **الیوشین ایکی ٹیشن مقابلہ:** شعبہ تاریخ وتہذیب اور گرلز ہاسٹل کے زیر اہتمام الیوشین ایکی ٹیشن مقابلہ کا انعقاد کیا گیا جس میں 44 طلبہ نے شرکت کی۔ یہ مقابلہ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں تھا۔ جج کے فرائض اقبال پرویز، سمن عسکری اور نجم سحر نے انجام دیے۔ اس مقابلے میں اول انعام انگریزی میں ارنیت اروڑا، اردو میں نوشاد منظر کو پروفیسر محمد میاں اور ظفر عالم نے دیے۔

● **چک دے انڈیا:** گرلز ہاسٹل کے زیر اہتمام ہی "چک دے انڈیا" کے عنوان سے مقابلہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ایس ایم افضل رجسٹرار شریک ہوئے۔ جج کے فرائض پروفیسر ہیمنتا جوشی اور پروفیسر ابراہیم نے ادا کیے اور نظامت کے فرائض عاتکہ عبدالکنان نے انجام دیے۔ مقابلے میں پہلا انعام گروندر سنگھ، شارق ضیا خاں اور ہمایوں کو دوسرا کوکب ناز کو تیسرا اور خصوصی انعام آرتی راٹھور کو دیا گیا۔

● **نکڑ ناٹک، شام غزل اور فلم کی نمائش، اسٹریٹ پلے، قوالی، کارٹون اور ڈرامے:** اس کے علاوہ سینٹر فار اسپینش اینڈ لٹن اسٹڈیز کا پروگرام انصاری آڈیٹوریم میں ایک فلم دکھائی۔ سی آئی ٹی میں اردو ڈبیٹ کا پروگرام منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر رادھا کمار، پروفیسر راجیو بھارگو، ڈاکٹر اوما چکرورتی اور پروفیسر مشیرالحسن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایکوکلب نے ایک نکڑ ناٹک گلوبل وارمنگ پر پیش کیا۔ انصاری آڈیٹوریم کے پنڈال میں شام غزل کا پروگرام جامعہ کے طلبہ وطالبات اور استاد ضمیر احمد نے پیش کیا۔ ڈاکٹر انصاری آڈیٹوریم میں شیام بینیگل کی فلم "منڈی" دکھائی گئی۔ ڈاکٹر شیما علیم کو آرڈی نیٹر، مسٹر پری سوسائٹی نے ورائٹی پروگرام کے تحت صوفی قوالی، فرنچ سونگس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام کی تیاری طلبہ وطالبات سے کرائی اور اس پر مبنی پروگرام پیش کیا۔ کیسر وکیلی میں جامعہ کے طلبہ وطالبات نے کارٹون مقابلے میں حصہ لیا۔ ریتا نے ایک اسٹریٹ پلے پیش کیا۔ شعبہ تاریخ وثقافت کے طلبہ وطالبات نے پریم چند کا "عیدگاہ" پر مبنی ڈراما ڈاکٹر انصاری آڈیٹوریم میں پیش کیا۔ ظفر زیدی اور طیبہ منور نے پریم چند آرکائیوز کے فوٹوز کی بنیاد پر ایک فوٹو ایگزیبیشن تعلیمی میلہ کے تعلق سے تیار کیا جس کی تاریخی طور سے بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ یہ فوٹو نمائش 1946 سے شروع ہوئی ہے۔ اس دوران پانچ روزہ تعلیمی میلہ میں کتابوں کی نمائش میں بھی بڑی بھیڑ رہی اور طلبہ وطالبات اور دوسرے لوگوں نے کتابیں خریدیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی طرف سے ادبا و شعرا کا اعزاز

● بھوپال، یکم نومبر۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اقلیتی بہبود اکھنڈ پرتاپ سنگھ نے آج کہا کہ اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں نہیں بلکہ ان کا رسم الخط جداگانہ ہے۔ ہماری کوشش ہونا چاہیے کہ اردو ہندی کے تعلق سے جو خلیج قائم ہے اسے پاٹا جائے اور زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ انسانیت کی خدمت کو بھی اپنا نصب العین بنا جائے۔

وزیر موصوف بحیثیت مہمان خصوصی آج شام یہاں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے جلسۂ یوم تاسیس کو خطاب کر رہے تھے۔ جلسے میں وزیر موصوف کے ہاتھوں اردو ادب کی پانچ ممتاز شخصیات کے ساتھ ہی اقبال لائبریری کے سکریٹری کا اعزاز کیا گیا۔ جلسے میں مدھیہ پردیش کے محکمۂ ثقافت کے سکریٹری اور کمشنر رابطۂ عامہ منوج شریواستو، اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر بشیر بدر، سکریٹری نصرت مہدی صاحبہ، مختلف محکمات کے اعلیٰ افسران اور ادبی شخصیات نیز شہری موجود تھے۔

نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اکادمی کے معاون سکریٹری اقبال مسعود نے مہمان خصوصی اور دیگر مہمانان کو خوش آمدید کہا جبکہ نصرت مہدی صاحبہ نے اردو اکادمی کی پیش رفت کی مختصر روداد بیان کی۔ موصوفہ نے کہا کہ ماہ نومبر کی مدھیہ پردیش اور اہل اردو کے لیے بڑی اہمیت ہے کیونکہ یکم نومبر کو مدھیہ پردیش ریاست کا قیام عمل میں آیا اور 4 نومبر کو اردو اکادمی کا قیام ہوا۔ انھوں نے وزیر اقلیتی بہبود اکھنڈ پرتاپ سنگھ کی جلسے میں شرکت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا اور تمام شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

بزرگ شاعر رضا رامپوری، صحافی و شاعر کوثر صدیقی، گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شاعر گووند آریہ نشاط، افسانہ نگار نعیم کوثر، ادیب و شاعر نصیر پرواز کا اکھنڈ پرتاپ سنگھ کے ہاتھوں شال اور مومینٹو پیش کر کے اعزاز کیا گیا۔ اس موقع پر اردو زبان وادب کی خدمات انجام دینے کے لیے اقبال لائبریری کے سکریٹری عمر انصاری کا بھی اعزاز کیا گیا۔

(ندیم، بھوپال)

ہندی اردو کا رشتہ گوشت اور ناخن جیسا

● نئی دہلی، 2 نومبر۔ حکومت اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور دوردرشن پر اردو کا 24 گھنٹے کا چینل معمار قوم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے یوم پیدائش 14 نومبر سے شروع ہو جائے گا۔ یہ اعلان آج مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات پر یہ رنجن داس منشی نے اردو کے معروف صحافی جی ڈی چندن کی تصنیف ''اردو صحافت کا سفر'' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ پی آئی بی کانفرنس ہال میں منعقد اس تقریب کی صدارت مرکزی وزیر توانائی سشیل کمار شنڈے نے کی۔ اس موقع پر پریہ رنجن داس منشی نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ ہندی اور اردو کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا رشتہ تو روٹی اور پانی کا ہے، صدارتی تقریر میں مرکزی وزیر سشیل کمار شنڈے نے کہا کہ جی ڈی چندن کی یہ کتاب میل کا ایک پتھر ہے اور اس کتاب سے ریسرچ اسکالروں کو کافی فائدہ حاصل ہوگا۔ ایک اچھے صحافی کا یہ فرض ہے کہ وہ سماج کے درد کو سامنے لائے۔ اردو کے بارے میں انھوں نے کہا کہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ زبان کو کسی مذہب سے نہیں جوڑنا چاہیے۔

ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین اور معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو اور ہندی کا تعلق گوشت اور ناخن کا ہے۔ یہ دونوں زبانیں ہندوستان میں نہیں بلکہ جنوبی ایشیا میں رابطے کی زبانیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو سیکولرازم، ثقافتی رشتوں اور مشترکہ تہذیب کا ایک پل ہے۔ اردو صحافت نے ملک کی آزادی کی جنگ میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے لیکن آج وہ چیلنجوں سے نبرد آزما ہے۔ انھوں نے اردو صحافت میں جی ڈی چندن کی خدمات کی ستائش کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جی ڈی چندن ایک درویش صفت انسان ہیں جنھوں نے کبھی بھی صلے کی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کتاب ''اردو صحافت کا سفر'' بہت اہم ہے اور اس شعبے میں کام کرنے والے عتیق صدیقی اور امداد صابری کے بعد وہ تیسرے شخص ہیں۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل کی ایڈیٹر منورما دیوان نے کہا کہ اردو صحافت کے لیے جی ڈی چندن کی خدمت ناقابل فراموش ہیں۔ اردو کے بارے میں انھوں نے کہا کہ آج اگر اردو والوں کی تعداد میں کمی آتی جارہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اردو کو اس کا حق نہیں ملا۔ منورما دیوان نے کہا کہ ملک کی آزادی اور پھر اس کے بعد اردو کی ملک کے لیے خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا تنگ نظری کی علامت ہے۔ اسے کسی ایک مذہب کے ساتھ جوڑنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ اس موقع پر مرکزی وزیر برائے اطلاعات و نشریات سے مطالبہ کیا گیا کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے 150 سالہ جشن کے دوران ملک کے پہلے شہید صحافی مولانا باقر علی کی دہلی میں ایک یادگار قائم کی جائے اور ایک لینگویج پریس کمیشن، کا قیام بھی عمل میں لایا جائے۔ اس موقع پر جی ڈی چندن کو ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ آخر میں وسیم الحق نے اظہار تشکر کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بہادر شاہ ظفر کے 232 ویں یوم پیدائش پر تقریب

● نئی دہلی، 24 اکتوبر۔ وسطی ضلع میں واقع علاقہ نبی کریم میں بہادر شاہ ظفر کے 232 ویں یوم پیدائش پر ایک پروگرام کا انعقاد وزیر اہتمام اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ سینٹر ہوا۔ صدارت ندیم شفیع نے کی۔ ندیم شفیع نے بہادر شاہ ظفر کی قربانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی پیدائش 24 اکتوبر 1775 کو ہوئی تھی اور وہ 28 ستمبر 1838 میں اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد تخت نشیں ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری قوم کی اکثریت اس بہادر انسان اور محسن وطن کی تاریخ پیدائش تو کیا نام تک صحیح ڈھنگ سے نہیں جانتی ہے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس انسان نے اپنی اولاد اور اپنا جسم و جاں وطن عزیز پر قربان کر دیا، اس کی اولاد آج ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

عبدالمنان نے کہا کہ 1857 میں جب جنگ آزادی کی چنگاری بھڑکنے والی تھی جس کو شہید ٹیپو سلطان وحیدر علی اور نواب سراج الدولہ نے بھڑکانے کی مسلسل کوشش کی تھی۔ عین اس موقع پر ہندوستان کے تمام سپاہیوں اور مہاراجاؤں نے بہادر شاہ ظفر کو متفقہ طور پر اپنا سمراٹ مان لیا تھا اور ان ہی کی ماتحتی میں 1857 کی جنگ لڑی گئی تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ تمام حقائق تاریخ کے پردے میں چھپتے جارہے ہیں۔ فیصل نواب نے کہا کہ ہم مسلمانوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کی قربانیوں کو فراموش کر دیا ہے۔ ہماری نئی نسلیں اپنی تاریخ سے نابلد ہوتی جارہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کریں اور ان کا ورثہ نئی نسلوں تک پہنچائیں۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی حب الوطنی کے بارے میں کہا کہ انھوں نے رنگون میں آخری سانس لیتے ہوئے بھی ہندوستان کی مٹی کو یاد کیا اور یہیں دفن ہونے کی تمنا لیے ہوئے مالک حقیقی سے جاملے۔ وہ برما رنگون میں ''شویڈاگون پگوڈا'' میں مدفون ہیں اور حکومت ہند کی ناانصافیوں کو محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری مرکزی حکومت بہت سارے ایام مناتی ہے لیکن وہ قوم کے اصل جیالوں اور سپاہیوں کی طرف توجہ نہیں دے رہی ہے۔

جھارکھنڈ میں اردو کی سرکاری حیثیت کا اعلان

● رانچی، جھارکھنڈ تنظیم کے مرکزی صدر مسٹر شمشیر عالم نے وزیر اعلی

مسٹر مدھوکوڑا کی طرف سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت کا نوٹیفکیشن جاری کیے جانے کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں مبارک باد پیش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جھارکھنڈ کے قیام کے سات سالوں میں یہ پہلا موقع ہے جب ریاست کی اقلیتی آبادی کے مطالبات میں سے کسی ایک مطالبے کی تکمیل ہورہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیراعلیٰ مدھوکوڑا کے اس اعلان سے ریاست کی اردو آبادی کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔ مسٹر شمشیر عالم نے جھارکھنڈ تنظیم کے ان سبھی کارکنان وعہدیداران کو بھی مبارک باد پیش کی جنھوں نے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دیے جانے کے مطالبے کو لے کر لگاتار جدوجہد کی، جلسے جلوس کیے اور دھرنوں اور مظاہروں کے ذریعے اپنی آواز بلند کی۔

(فاروقی تنظیم، رانچی)

● رانچی، 18 اکتوبر کو پٹھان یوتھ ویلفیئر سوسائٹی کی ایک بیٹھک رضوان خان کی صدارت میں ناظر علی لین میں ہوئی۔ بیٹھک میں وزیراعلیٰ کی طرف سے اردو کو جھارکھنڈ کی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دیے جانے پر خوشی کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ جھارکھنڈ کے اردو سماج کو عید کا بہترین تحفہ ہے، بیٹھک میں وزیراعلیٰ مدھوکوڑا اور حکومت جھارکھنڈ کے تمام وزرا کو پٹھان یوتھ ویلفیئر سوسائٹی نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت قبول کرنے کے لیے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ بیٹھک میں خصوصی طور سے جاوید خان، دانش خان، محمد شہزاد خان، سلیم خان، اقبال خان، ظہیر خان، سنی خان، سجاد خان، ممو خان، مستر خان، معراج خان، عقیل خان، شفیق خان، مظہر خان وغیرہ نے شرکت کی۔

● جمشید پور، 17 اکتوبر۔ جھارکھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے سے متعلق نوٹیفکیشن جاری ہوجانے سے اردو داں طبقے میں خوشی کی لہر ہے، ساتھ ہی ان میں یہ جذبہ بھی نظر آرہا ہے کہ کس طرح عملی طور پر اس کی اہمیت بنائے رکھی جائے۔ اردو داں طبقے کی طرف سے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا اور وزیراعلا کو مبارک باد بھی دی گئی ہے۔ ایک طرف جہاں ورکرس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر صفدر رضی نے خوشی کا اظہار کیا وہیں یہ بھی کہا کہ اب اردو داں طبقے کی ذمے داری بھی بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خاص کر درس و تدریس سے جڑے لوگوں کی ذمے داری اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو اس کا حق ملنا ہی چاہیے تھا، دیر سے ہی سہی لیکن حکومت جھارکھنڈ مبارک باد کی مستحق ہے۔ بزم اردو جمشید پور کی بھی ایک میٹنگ ہوئی جس میں کہا گیا اب حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ اردو کی درسی کتابیں مہیا کرائی جائیں، اردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا جائے اردو کے اساتذہ کا تقرر اور اردو داں کلرکوں اور افسران کی بحالی کی جائے۔ مسلم ادھیکار مورچہ نے بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا نوٹیفکیشن جاری کرنے پر وزیراعلا مدھوکوڑا، یوپی اے اسٹیئرنگ کمیٹی کے چیئرمین شیبو سورین، آر جے ڈی کے ریاستی صدر گوتم ساگر رانا، کانگریسی وزیر سبودھ کانت سہائے، کانگریس کے جھارکھنڈ انچارج اجے ماکن اور پروفیسر نجم انصاری کو مبارک باد دی ہے۔ مورچے کے شہواز حسن کی طرف سے جاری بیان میں کہا گیا ہے کہ جلد ہی ان تمام حضرات کو جمشید پور میں پروگرام منعقد کرکے استقبالیہ دیا جائے گا۔ دیگر ادبی تنظیموں اور اداروں کے نمائندوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ ادھر اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے نوٹیفکیشن سے آدیواسیوں کے ایک گروپ میں زبردست ناراضگی دیکھی جارہی ہے، یہ لوگ قبائلی زبان سنتالی اور بنگلہ کے بجائے اردو کو درجہ دیے جانے سے ناراض ہیں۔

(اخبار مشرق، دہلی)

مسلم خواتین کانفرنس

● جھانسی، 23 اکتوبر۔ عورت کی آزادی کو لے کر چل رہی بحث کو آج خواتین نے ایک نیا موڑ دیا۔ مسلم خواتین تعلیم کانفرنس میں انھوں نے اپنے ارادے ظاہر کردیے کہ انھیں آگے تو بڑھنا ہی ہے بس کچھ بندشیں ہیں جن سے وہ پریشان ہیں انھی بندشوں اور پریشانیوں کا حل مسلم تعلیم یافتہ خواتین نے کانفرنس میں بتایا۔ سبھی نے ایک رائے سے کہا کہ تعلیم مسلم خواتین کا اسلامی حق ہے اس کو پانے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اپنے حقوق کو جاننے اور پانے کے لیے انھیں تعلیم حاصل کرنا ہی چاہیے۔

سیرت ایجوکیشنل سوسائٹی کی قیادت میں نیشنل حافظ صدیقی انٹر کالج میں آج مسلم خواتین کی زبردست موجودگی نے دوسرے سال کانفرنس کو بڑی کامیابی دلائی۔ اس میں رہ رہ کر ایک ہی سوال اٹھا کہ مسلم خواتین کی تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟ جانکاروں نے ان سوالوں کے جواب دیے۔

خواتین کو گھروں سے نکالنا کافی دشواریوں بھرا کام ہے خاص کر مسلم خواتین کسی کانفرنس میں جائیں اس کی تو امید نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ کثیر تعداد میں تعلیم جیسے موضوع پر سننے کے لیے نہ صرف گھروں سے آئیں بلکہ پانچ گھنٹوں تک بیٹھی بھی رہیں۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ان میں کئی خواتین ان پڑھ بھی تھیں جو صرف تعلیم کی باتیں سننے کے لیے ہی وہاں پہنچی تھیں یہ کسی انقلاب کے آغاز سے کم نہیں ہے۔

خاکسار عبدالمجید نے آج کی کانفرنس کے مقصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ جھانسی میں سرسید ڈے کے موقع پر انفارمیشن مانیٹرنگ کم فسلیٹیشن سینٹر قائم کیا گیا ہے اس سینٹر پر مسلم بچوں بچیوں کو کیریئر سے متعلق رہنمائی ملے

گی۔ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند عورتوں اور مردوں کے سامنے آرہی کسی بھی طرح کی پریشانی کو چاہے وہ مالی ہو یا معاشرتی، دور کرنے میں ان کی مدد کی جائے گی۔ (انکشاف، جھانسی)

ہبلی میں سیمینار اور مشاعرہ

● کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کے زیر اہتمام بروز سنیچر مورخہ 20 اکتوبر شہر ہبلی کے جے سی نگر میں واقع چیمبر آف کامرس ہال میں ملا عبدالغنی کے فن خدمات اور شخصیت پر ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں ریاست کرناٹک کے مختلف گوشوں سے ماہرین نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کا افتتاح سابق وزیر جناب عبدالحکیم ہنڈسگری نے کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر خالد سعید نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مرحوم کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ جناب ش نذیر الدین، جناب ائل ٹھکر، جناب ارشد ملا فرزند جناب ملا عبدالغنی نے مرحوم کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اقبال النسا (بنگلور) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد) ڈاکٹر اکرام باگ، بسواکلیان (بیدر) اور جناب حامد اکمل (گلبرگہ) نے ملا عبدالغنی کے فن اور ان کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا۔ پروفیسر م ن سعید، صدر کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور نے اپنے صدارتی خطبے میں مرحوم ملا عبدالغنی پر سیمینار کے انعقاد پر اہالیان ہبلی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی ریاست کرناٹک کی ادبی شخصیات کی ادبی حلقوں میں پہچان اور تعارف کی خاطر اس قسم کے پروگرام منعقد کرتی آرہی ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ جلسے کا آغاز مولانا نذیر الدین کی قرأت سے ہوا۔ جناب مظہر محی الدین مقامی کنوینر اور رکن اکادمی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے استقبال بھی کیا۔ پروفیسر ایس محمد رحمت الحق، رجسٹرار کے اظہار تشکر پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

اسی روز شب کے 10 بجے سوائی گندھرواہال، دیش پانڈے نگر میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں مقامی اور بیرونی شعرا نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ و مسحور کیا۔ صدارت جناب ساغر کرناٹکی نے کی اور جناب محب کوثر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب عبدالحکیم ہنڈسگری سابق ریاستی وزیر جناب جبار خان ہونلی، سابق ریاستی وزیر اور جناب اسماعیل کالے بڈے، سابق ایم ایل سی مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پورے مشاعرے میں حاضر رہے۔

دونوں تقریبات میں ہبلی شہر اور اطراف و اکناف سے کثیر تعداد میں ادب نواز خواتین و حضرات نے شرکت کرتے ہوئے ان محفلوں کو کامیاب بنانے میں اپنا تعاون پیش کیا۔ (ڈاک سے)

شیموگہ میں سمپوزیم اور مشاعرے کا انعقاد

● کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کے زیر اہتمام بروز چہار شنبہ مورخہ 24 اکتوبر 2007 کو ''کرناٹک میں اردو افسانے کے پچاس سال'' موضوع پر ایک سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا۔

پروفیسر م ن سعید صاحب کی غیر حاضری میں رکن، اکادمی پروفیسر حمید سہروردی نے صدارت کی ذمے داری سنبھالی'' شری اودے کمار آئی ایف ایس رجسٹرار کویمپو یونیورسٹی، شیموگہ نے شمع روشن کرتے ہوئے افتتاح کیا اور اپنے خطبے میں اردو زبان کی شیرینی لطافت اور دلکشی کی کئی مثالیں پیش کیں۔ شری ایس وی تمپا، سکریٹری، نیشنل ایجوکیشن سوسائٹی نے اردو زبان کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے اردو میں صوفیانہ شاعری کو سراہا اور تجویز پیش کی کہ اردو کی اہم تصانیف کا کنٹر زبان میں ترجمہ پیش کیا جائے، ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ ریجنل ڈائرکٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بنگلور نے کلیدی خطبہ پیش کیا، ڈاکٹر ایس ایم عقیل کنوینر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی جلسے کے بعد پہلی نشست میں پروفیسر حمید سہروردی کی صدارت میں جناب آفاق عالم نے کرناٹک میں افسانہ نگاری کے موضوعات اور مسائل پیش کیے اور ڈاکٹر سی سید خلیل احمد نے '' پچاس سالہ افسانوں کا اجمالی جائزہ عنوان کے تحت مقالہ پیش کیا۔ دوسری نشست میں ڈاکٹر اکرام باگ، رکن کرناٹک اردو اکادمی کی صدارت میں جناب یوسف عارفی نے ''کرناٹک میں غیر روایتی افسانے کے پچاس سال' اور ڈاکٹر اقبال النساء نے 'کرناٹک میں اصلاحی افسانے کا رجحان'' عنوانات کے تحت اپنے مقالے پیش کیے۔ اسی روز شام جناب مظہر محی الدین صاحب رکن، کرناٹک اردو اکادمی کے زیر صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مقامی و بیرونی شعرائے کرام نے اپنی تازہ ترین نگارشات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ایس ایم عقیل نے سنبھالے اور انھیں کے شکریے پر دن بھر کی ادبی کارروائیاں اختتام پذیر ہوئیں۔ (ڈاک سے)

کتاب خانہ رحمانیہ میں نادر کتابوں کا ذخیرہ

● مونگیر، 10 نومبر۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد نے ایک وفد کے ساتھ مونگیر کا دورہ کیا۔ یہاں انھوں نے سب سے پہلے مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا منت اللہ رحمانی کے مزارات پر حاضری دی۔ مسجد رحمانی اور جامعہ رحمانی و تعلیم گاہ جامعہ رحمانی کی عمارت کو دیکھا اور مولانا ولی رحمانی سے ملاقات کرکے دعائیں لیں۔ انھوں نے کتب خانہ رحمانیہ

کا معائنہ کیا اور کہا کہ مجھے اکثر کتب خانوں اور مخطوطات کے ذخیروں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مگر یہاں کا نظم وضبط بڑا عمدہ ہے اور کتابیں اچھی حالت میں ہیں۔ یہاں سات سو سال پرانی ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔ جو بڑی اہم بات ہے۔ ڈائرکٹر امتیاز احمد جامعہ رحمانی کے طلبہ کے ہاتھوں لکھے ہوئے مجلے ''الجامعہ'' کی صاف شفاف تحریر کو دیکھ کر بھی بے حد متاثر ہوئے اور کہا کہ نو عمری میں اس طرح کی پختہ تحریریں ان کے کامیاب مستقبل کی ضمانت ہیں۔ جامعہ رحمانی کے سرپرست، یہاں کے اساتذہ، منتظمین اور کارکنان قابل مبارک باد ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو والے صرف گفتار کے غازی ہیں

● نئی دہلی، 11 نومبر۔ ہم اردو زبان کی ترویج و ترقی کے نام پر تقریبات تو منعقد کرتے ہیں لیکن سچائی یہ ہے کہ ہم خود اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینا مناسب نہیں سمجھتے جب تک اردو کے تعلق سے یہ بے اعتنائی برتی جاتی رہے گی اردو زبان کی ترقی کی بات کرنا فضول ہی ہوگا۔ اردو کی ترقی میں مدارس اسلامیہ کا کردار نمایاں رہا ہے جو بدستور آج بھی جاری ہے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو پڑھنے والوں کا اگر جائزہ لیں تو 90 فیصد طلبہ انھی مدارس سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ یہ باتیں انجمن تعلیمات دین بستی، کے آرگنائزر مولانا مجیب بستوی نے ہندوستان ایکسپریس سے گفتگو کے دوران کہیں۔ وہ یہاں علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر دہلی یونیورسٹی میں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقد یوم اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج اردو کی بقا اور ترقی کے نام پر شور شرابے تو خوب ہوتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا دانشور اردو داں طبقہ اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا شان کے خلاف سمجھتا ہے تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو اردو کے نام پر اسکولوں اور دیگر سرکاری اداروں میں ملازمت کرتے ہیں، وہ بھی آج اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے سے گریز کرتے ہیں اور جابجا اردو کی بدحالی کا رونا روتے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ حکومتوں کا کام ہے حکم نامہ جاری کرنا اس پر عمل آوری کے لیے تو ہمیں ہی کوشش کرنی ہوگی۔ اتر پردیش میں اردو کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل تو ہے لیکن یہ عملاً کہیں نظر نہیں آتا صوبے کی سابقہ حکومت نے اپنے دور میں ایک حکم نامہ جاری کیا تھا کہ سبھی محکموں کے دفاتر پر اردو میں نام کی تختیاں لگائی جائیں۔ لیکن اس کا حال یہ ہے کہ ہندی زبان کو اردو رسم الخط میں کہیں کہیں لکھ دیا گیا ہے اس کے لیے اردو والوں نے کیا کیا؟ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

یوم سرسید پر سیمینار، مشاعرہ اور تقسیم ایوارڈ

● سرسید احمد خاں کے یوم پیدائش پر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے ایک سیمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا اور تعلیمی میدان میں نمایاں کام کرنے والوں کو اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔

پروگرام کی صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی جبکہ مہمان خصوصی جناب کوکب حمید تھے دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر شہپر رسول بھی شریک ہوئے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ سرسید نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے اور آج جو تعلیمی ترقی ہم دیکھ رہے ہیں اس میں سرسید کی کوششوں کو بہت دخل ہے۔ مہمان خصوصی جناب کوکب حمید نے کہا کہ سرسید کی تصانیف کو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں شائع کرانا ہماری اہم ذمے داری ہے۔

اجلاس کے دوسرے دور میں انعامات تقسیم کیے گئے پرائمری تعلیم کے لیے آفاق احمد خاں اور نایاب زہرہ زیدی، ثانوی تعلیم کے لیے حاجی غلام محمد اور طاہرہ رضوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈاکٹر ایف رحمان اور پروین فاطمہ اور اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے نور محمد مسعودی اور ڈاکٹر فرحت جہاں کو ایک ایک شال اور یادگار نشان پیش کیا گیا۔

پروگرام کے تیسرے دور میں ایک شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس میں بی ایس جین جوہر، شہپر رسول، ڈاکٹر مشتاق صدف، سید اطہر الدین، ڈاکٹر یونس غازی، فخری اور نذیر میرٹھی نے اپنا کلام پیش کیا۔ پروگرام کا آغاز محمد مستمر کی تلاوت کلام پاک سے ہوا بعد ازاں ترانۂ ہندی عفت ذکیہ اور فرزانہ نے پیش کیا۔ شعبہ کی استاد شاداب علیم نے تعارفی کلمات کہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد ارشد اور ڈاکٹر افشاں ملک نے انجام دیے۔ آخر میں ظفر گلزار نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

آرہ میں اردو کمپیوٹر سینٹر کا قیام

● آرہ۔ جناب محمد یٰسین انصاری نے رضا کار تنظیم عبدالقیوم انصاری ادیوگ دو پایہ محلہ قاضی ٹولہ سرائے آرہ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کی طرف سے کمپیوٹر سینٹر کی منظوری دیے جانے پر جناب ڈاکٹر علی جاوید

ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا اور موجودہ دور میں کمپیوٹر تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو اس دور میں کمپیوٹر تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ایسے غریب طلبہ وکمرشیل سینٹروں میں بڑی بڑی رقمیں دے کر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔ انھیں خاص طور پر حکومت ہند کے پروگرام سے فائدہ اٹھانا چاہیے جس میں رعایتی فیس پر کمپیوٹر تعلیم دی جاتی ہے۔ (ڈاک سے)

اردو مضمون ہٹائے جانے پر غم وغصہ

● میرٹھ، 21 اکتوبر۔ یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود تمام سرکاری پرائمری اسکولوں سے اردو مضمون ہٹائے جانے پر نیشنل مائنارٹیز فرنٹ نے شدید غم وغصہ کا اظہار کیا ہے۔ اس معاملے میں وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سرکاری عہدوں پر بیٹھے ہوئے ایسے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جانی چاہیے جنھوں نے اردو مخالف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر معراج الدین احمد نے بتایا کہ یوپی کے تمام بیسک شکشا ادھیکاریوں کے نام حکومت کے طرف سے ایک خط بھیجا گیا ہے، جس میں سرکاری پرائمری اسکولوں میں اردو ختم کردینے کی بات کہی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اردو مخالف ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ سے مانگ کی کہ سرکاری عہدوں پر بیٹھے ہوئے ایسے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی عمل میں لائی جائے۔ پریس کانفرنس میں فرنٹ کے قومی صدر حاجی جی ایم مصطفیٰ، کارپوریٹر سلیم بھارتی، ڈاکٹر راشد، کنوینر نزاکت علی حیش نوی، زاہد سیفی اور نسیم ایڈووکیٹ وغیرہ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو مضمون ہٹانے کی نکتہ چینی

● الہ آباد، 20 اکتوبر۔ ادبی ولسانی تنظیم اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اترپردیش حکومت کی طرف سے پرائمری اسکولوں سے اردو مضمون کو ہٹانے اور درجہ پانچ تک صرف ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبان کی ہی تعلیم دینے کے فیصلے کی نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ حکومت کا یہ فیصلہ آئین ہند کے خلاف ہے۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے آج یہاں جاری ایک بیان میں کہا کہ اترپردیش حکومت کے ایک بیسک ایجوکیشن ڈائرکٹر نے جولائی 2007 میں ایک سرکلر جاری کرکے ریاست کے تمام ریجنل اسسٹنٹ ڈائرکٹرز ایجوکیشن (بیسک) اور تمام ضلع کے بی ایس اے کو ہدایت دی ہے کہ وہ ہر ایک پرائمری اور جونیر ہائی اسکول کے صدر دروازے پر موجود نوٹس بورڈ پر پڑھائے جانے والے منظور شدہ مضامین کی تفصیل لکھوانے کے ساتھ ہی یہ لکھوائیں کہ اسکول میں منظور شدہ مضامین کی ہی تعلیم دی جائے گی اور غیر منظور شدہ مضامین (یعنی اردو وغیرہ) نہیں پڑھائے جائیں گے۔

اس سرکلر کے ساتھ درجہ ایک سے آٹھ تک پڑھائے جانے والے منظور شدہ مضامین کی فہرست بھی جاری کی گئی ہے جس میں زبان کے نصاب میں صرف ہندی، سنسکرت اور انگریزی کا ہی ذکر کیا گیا ہے اور ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کو نکال دیا گیا ہے جبکہ سابقہ حکومتوں نے سنسکرت یا اردو اختیاری مضامین رکھے تھے۔

مذکورہ سرکلر کی فوٹو کاپی اردو میڈیا کو مہیا کراتے ہوئے آرگنائزیشن کے بانی وکنوینر بحرالعلوم اور قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا کہ اترپردیش حکومت کا یہ سرکلر آئین ہند کی دفعہ 350A اور سہ لسانی فارمولا کے خلاف ہونے کے ساتھ ہی یوپی آفیشل لینگویج امینڈمنٹ ایکٹ 1989 کے بھی خلاف ہے۔

تنظیم نے اس سرکلر کو عدالت عالیہ میں چیلنج کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔
(ہمارا مقصد، نئی دہلی)

انٹر کالج کی سطح پر اردو تعلیم کو یقینی بنانے کی ضرورت

● موانہ، 21 اکتوبر۔ یہاں سے تقریباً 12 کلومیٹر قصبہ پھلاودہ میں انجمن ارتقائے اردو کی جانب سے ''ہندوستان میں اردو زبان اور اس کا وجود'' کے عنوان پر مدرسہ دربار میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت حافظ سالک رضوی نے کی اور بطور خصوصی مہمان نگر پنچایت چیئرمین مرزا شفیق الدین نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں دیگر زبانوں کے لفظ شامل ہونے سے یہ ہر ہندوستانی کی زبان ہوگئی ہے۔ یہ عوام کی اپنی زبان ہے انوار الحق شاداں نے کہا کہ اردو زبان کی پستی کے ذمے دار ہم خود ہیں۔ ہم مشاعروں میں تو بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن اردو کی کتابیں، رسالے اور اخبار پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے جو بڑے افسوس کی بات ہے حافظ سالک رضوی نے کہا کہ ہمارے بچوں کی پرائمری اسکول اور مدارس کے بعد انٹر کالج میں اردو کا انتظام نہ ہونے سے اردو کی طرف توجہ نہیں رہتی ہے۔ ہمیں اس طرف دھیان دینا چاہیے۔ حافظ محمد طالب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر استاد شعرا کو ان کی ادبی خدمات کے لیے اعزاز دیا گیا۔ نظامت مرزا منہاج الدین نے کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''اردو اور سیاسی نشیب وفراز''

● بجنور: یوم اردو کے موقع پر دفتر ''آئینہ حالات'' میں ایک پروگرام ''اردو اور سیاسی نشیب وفراز'' کے عنوان سے منعقد کیا گیا جس کی صدارت جنوں سہسپوری اور نظامت تہذیب ابرار نے کی۔ آغاز قاری انیس احمد کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ معروف شاعر جنوں سہسپوری نے کہا کہ زبانیں صرف حکومت کے رحم وکرم پر زندہ نہیں رہتیں، بلکہ اہل زبان کا اپنی زبان کو خون جگر پلانا، زبان کی نشوونما کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہفت روزہ ''آئینہ حالات'' کے ایڈیٹر اقبال راجہ نے کہا کہ اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی تاریخ کی حفاظت ایک طرح سے اپنے دین کی حفاظت ہے کیونکہ ہمارا اکثر مذہبی وملی سرمایہ اردو میں محفوظ ہے۔

تہذیب ابرار نے کہا کہ یہ مقابلے کا دور ہے، اردو چیلنج کا سامنا کررہی ہے، یہ کہنا کہ دو زبانیں متصادم ہیں، دو تہذیبیں متصادم ہیں، غلط ہے کیونکہ تہذیبیں آپس میں کبھی نہیں ٹکراتیں، ہمیشہ وحشتیں ٹکراتی ہیں۔ ''اردو نیوز'' جدہ (ریاض) کے کالم نگار شاداب سکران نے واضح کیا کہ خلیج میں اردو کا جادو اس معنی میں سرچڑھ کر بول رہا ہے کہ وہاں کی مقامی زبان میں اردو کے اختلاط کا فیصد بڑھ رہا ہے اور یہ خوشگوار تبدیلی اردو کے لیے خوش آئند ہی ثابت ہوگی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ضمیر احمد، شکیل احمد (پیرجی) نمائندہ بجنور ٹائمنز و چنگاری، چودھری ندیم احمد، محمد صابر بزمی اور حافظ محمد صابر نمائندہ راشٹریہ سہارا اردو نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

2005 کی مطبوعہ اردو کتابوں پر
مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات

ہندوستان گیر پیمانے پر

● (الف) مبلغ پانچ ہزار روپے کے انعامات

1. تھکے نہ میرے پاؤں از: رفعت سروش (تخلیقی ادب)
2. فردوفن از: علیم اللہ حالی (تحقیق وتنقید)
3. یوگا کی سائنس اور صحت، اصول وورزش اور علاج از: محمد اشفاق قریشی (دیگر موضوعات)

(ب) مبلغ تین ہزار روپے کے انعامات

1. سلاٹر ہاؤس از: یٰسین احمد (تخلیقی ادب)
2. بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد از: ڈاکٹر سید داؤد اشرف (تحقیق وتنقید)
3. الیکٹرانک میڈیا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن از: محمد امتیاز علی تاج (دیگر موضوعات)
4. کمپیوٹان از: وکیل نجیب (ادب اطفال)

(ج) مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات

1. پیشن گوئی از: صغرا مہدی (تخلیقی ادب)
2. نثری بیانیہ از: ڈاکٹر مجید بیدار (تحقیق وتنقید)
3. انوکھے پرندوں کی دنیا از: محمد خلیل سائنس داں (ادب اطفال)

(د) مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے کے انعامات

1. آفتاب حسنین کی کہانیاں جانوروں کی از: آفتاب حسنین (ادب اطفال)

مغربی بنگال کی سطح پر

(الف) مبلغ پانچ ہزار روپے کے انعامات

1. بازیافت از: ندیم احمد
2. مرشدآباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ از: ڈاکٹر عمر غزالی

(ب) مبلغ تین ہزار روپے کے انعامات

1. شام بھی تھی دھواں دھواں از: رفیق انجم
2. اونچے مکانوں کے قریب از: ف س اعجاز

(ج) مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات

1. کھیل کھیل میں از: ڈاکٹر مظفر حنفی
2. تذکرہ مشاہیر ادب شیخ پورہ از: ابوالکلام رحمانی
3. اردو ڈرامہ پس منظر، منظر از: شیخ الماس
4. سفر مقدر ہے از: احمد کمال حشمی

ناشرین کو انعامات

ہندوستان گیر پیمانے پر

(الف) مبلغ دو ہزار روپے کے انعامات

1. خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ-800004
2. اثبات ونفی پبلی کیشنز، 5/89 رپن اسٹریٹ، کولکاتا-700016

(ب) مبلغ ایک ہزار روپے کے انعامات

1. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
2. رحمانی پبلی کیشنز 1032 اسلام پورہ، مالیگاؤں-423203

(ج) نفیس طباعت پر مبلغ ایک ہزار روپے کے دو انعامات

1. اکادمی دریافت، 3/سی بنگالی شاہ وارثی لین،
کولکاتا-23 برائے بازیافت
2. گلستان پبلی کیشنز، 16 زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-73،
برائے شام بھی تھی دھواں دھواں (ڈاک سے)

محترمہ جمیلہ فاروقی کے انتقال پر تعزیتی نشستیں

● الہ آباد۔ اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر بہت رنج اور افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ 19 اکتوبر کو محترمہ جمیلہ فاروقی کا انتقال ہوگیا۔ محترمہ جمیلہ فاروقی مشہور نقاد اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی کی رفیقۂ حیات تھیں اور ان کے علمی اور ادبی کاموں میں ہمیشہ تعاون کرتی رہیں۔ وہ عہد ساز رسالہ ''شب خون'' کی مدیرہ بھی رہیں۔ فاروقی صاحب کے لیے ان کی دائمی جدائی ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ جس کی تلافی ممکن نہیں۔

آج یہاں قومی اردو کونسل کی طرف سے مرحومہ کے انتقال پر اظہار غم اور ان کی روح کو ایصال ثواب کے لیے تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں شہر کے اردو اور ہندی کے اہل علم وقلم اور دلی سے پروفیسر شمیم حنفی اور اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید بھی شریک ہوئے۔ مقررین نے مرحومہ جمیلہ فاروقی کے لیے اظہار عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی ان بے لوث خدمات پر بھی روشنی ڈالی جو انھوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی اور فروغ کے لیے نام ونمود کی خواہش کے بغیر انجام دیں۔ جلسے کی صدارت فردوس وانی رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی نے کی ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مرحومہ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ جمیلہ فاروقی نہ صرف یہ کہ ایک بڑے ناقد کی اہلیہ تھیں بلکہ الہ آباد میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے انھوں نے جو کاوشیں کی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے واضح کیا کہ تمام ہندوستان میں چلنے والے قومی کونسل کے تقریباً 300 کمپیوٹر مراکز میں اگر پانچ بہترین سینٹروں کا انتخاب کیا جائے تو ان میں ایک مرکز قدوائی میموریل گرلز انٹر کالج بھی ہے جس کی سرپرست اعلا مرحومہ تھیں۔ دیگر مقررین میں ڈاکٹر نغمہ پروین، ڈاکٹر نعیم الرحمٰن وغیرہ شامل تھے۔ مقررین نے قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین شمس الرحمٰن فاروقی کے غم کو پوری اردو دنیا کا غم قرار دیا اور بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ وہ انھیں اس غم کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرے۔ جلسہ مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت پر ختم ہوا۔

(قومی آواز، دہلی)

● شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی شریک حیات محترمہ جمیلہ فاروقی کے انتقال پر ملال پر ''ضوفشاں، الہ آباد کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ مرحومہ کا شمار الہ آباد میں ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا وہ تعلیم نسواں کی بہت بڑی مبلغ اور داعی تھیں انھوں نے 1954 تک حمیدیہ گرلس انٹر کالج میں پرنسپل کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد قدوائی انٹر کالج قائم کیا اور اس کو صوبے کے باوقار کالج کا درجہ دلوایا۔ اس کالج کا نتیجہ ہمیشہ 85% سے زائد رہا۔ ایک دیگر کالج ''المرۃ'' بھی قائم کیا۔ مرحومہ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اور بھی ہے کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کی شخصیت کو سنوارنے میں کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مرحومہ جمیلہ فاروقی نے اس قول کی صداقت ثابت کردکھائی۔ وہ پورے پچاس برس تک فاروقی صاحب کے صحافتی، تنقیدی اور تخلیقی سفر میں نہ صرف معاون بلکہ ساتھی رہیں۔ ہم اراکین ضوفشاں الہ آباد، فاروقی صاحب کے غم میں شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور محترم فاروقی صاحب کو، بیٹیوں کو اور دیگر ورثا کو اس جانکاہ الم کے برداشت کی طاقت عطا فرمائے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● نئی دہلی، 13 نومبر۔ سہ ماہی ادبی وتہذیبی میگزین 'درون' کے افتتاحی شمارے پر مذاکرے کے دوران کل شام اس سوال پر کافی سنجیدہ بحث ہوئی کہ اردو ادب کے سنجیدہ قاری تک پہنچنے کی آسان صورتیں کیا ہوسکتی ہیں اور ''درون'' کے قارئین کے حلقے کو وسیع کرنے کے لیے کتب فروشوں کی مدد لینے کی بجائے راست قاری تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے۔ اردو پریس کلب کے زیر اہتمام ''درون'' کے دفتر میں منعقدہ اس تقریب میں خورشید اکرم نے ادب کی موجودہ صورت حال، اخبارات و رسائل اور قارئین کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ ''درون'' پر مذاکرے میں شرکت کے لیے ہوڑہ (مغربی بنگال) سے آئے ہوئے مہمان خصوصی معروف شاعر فیروز اختر نے ''درون'' اور اس کے مرتب کے بارے میں تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اشہر ہاشمی ایک ایسے ذہین اور باصول ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے ابتدا سے ہی ادب کو سنجیدگی سے پڑھا، لکھا اور برتا ہے۔ اس تقریب کے صدر ڈاکٹر طارق ذکی نے ''درون'' کی توسیع واشاعت میں کافی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اظہار ندیم نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ اشہر ہاشمی نے جس مقصد کو سامنے رکھ کر ''درون'' کی اشاعت شروع کی ہے وہ مقصد پہلے ہی دن سے پورا ہورہا ہے۔ ممتاز اور معتبر صحافی سید منیر نیازی ''درون'' کے ایڈیٹر مسیح الزماں عارف، اسسٹنٹ ایڈیٹر عبدالوہاب، ماجد انور، ڈاکٹر شمس الہدیٰ، ثناء اللہ ثنا دوگھری اور نورالہدیٰ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آغاز میں اشہر ہاشمی نے ''درون'' کا تعارف کرایا اور اس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ایک قومی زبان ہے نہ کہ صرف مسلمانوں کی۔ جیسا کہ اردو دشمنی میں اردو کو مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ایسی صورت میں ہم محبان اردو کی ذمے داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ ہم اپنا احتساب کرکے اپنی کوتاہیوں کو دور کریں۔ اپنے نونہالوں کے روشن مستقبل کے لیے دیگر علوم کے ساتھ اردو کی تعلیم ضرور دیں۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح اردو کے فروغ کی خاطر ایک رقم مختص کریں۔ اردو کے مسائل سے ہر شخص واقف ہے۔ لیکن انھیں حل کرنے کے سلسلے میں کوتاہیاں ہوئی ہیں ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں اردو کو جگہ دینی ہوگی۔ اسکول اور کالج کے اساتذہ کو بھی احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ اردو مضمون پڑھانے میں اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مستعدی کا ثبوت دیں۔ اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے کے مراکز قائم کیے جائیں۔ وفد کے ساتھ اہل محلہ سے باہمی تعاون کی اپیل کریں۔

جو لوگ لاعلمی کے سبب اردو مخالف نظریات رکھتے ہیں ان کو بتانے کی ضرورت ہے کہ اردو نے ملک اور اہل ملک کو کیا کچھ نہیں دیا۔ اس نے محبت اور یگانگت کا درس دیا اور مساوات اور انسانیت کا سبق پڑھایا۔

متذکرہ بالا خیالات کا اظہار پروفیسر احمر لاری، ڈاکٹر عبیداللہ چودھری، ڈاکٹر محمد پرویز لاری، حافظ حمایت اللہ، محمد افراہیم، سید نورالحسن، وجاہت حسین، مقبول حسن لاری، محمد وسیم، زیڈ اے خان، محمد آصف، شمس الحسن لاری، عامر جمال، محمد عظیم خاں اور دیگر حضرات ناصر لائبریری گورکھپور میں ''فروغ اردو کیوں اور کیسے'' کے عنوان سے ایک مذاکرہ اور ادبی نشست میں کیا۔ نشست کی صدارت انجینئر محمد پرویز صدیقی نے کی۔ مہمان خصوصی علیم عالمی صاحب اور مہمان ذی وقار دھیان سنگھ نیپالی تھے۔ محفل کا آغاز حافظ عتیق الرحیم ندوی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ افتتاحیہ کلمات روشن صدیقی نے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض مولانا فضل الرحمن انظر قاسمی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● بروز ہفتہ مورخہ 8 ستمبر 2007 شام 6 بجے بمقام ایوان اردو ہال، انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ گلبرگہ میں افلاک پبلی کیشن کے زیر اہتمام خلیل مامون کی نظموں کے مجموعے ''آفاق کی طرف'' کی رسم اجرا بدست فضیل جعفری عمل میں آئی۔ جناب وہاب عندلیب کے زیر صدارت اس جلسۂ رسم اجرا میں بہ حیثیت مہمانان خصوصی زبیر رضوی دہلی، ماہر منصور، بنگلور، شائستہ یوسف، بنگلور، ڈاکٹر اکرام باگ کے علاوہ ڈاکٹر خالد سعید، صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد نے شرکت فرمائی۔ جلسہ رسم اجرا کا آغاز ڈاکٹر عبدالحمید اکبر، کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ جواں سال شاعر اکرام نقاش نے خلیل مامون اور تمام مہمانان خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا مختصر تعارف بھی پیش کیا۔

مختلف ادبی و علمی انجمنوں کے ذمے داران نے خلیل مامون کی گلپوشی فرمائی۔ گلپوشی کے بعد فضیل جعفری نے خلیل مامون کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ چار سو صفحات پر مشتمل شعری مجموعے کو سرسری طور پر پڑھ کر نظموں کے بارے میں اظہار خیال بڑا ہی مشکل کام ہے۔ خلیل مامون کی شاعری بالخصوص ان کی نظموں کی ہیئت اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے فضیل جعفری نے کہا کہ خلیل مامون کی شاعری رفتہ رفتہ پانی کی طرح اپنا راستہ بنائے گی۔ جدیدیت کا صحیح احساس ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ کہیں کہیں ن م راشد کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں رومانی نظمیں بہت کم ہیں مگر جو بھی ہیں بڑی عمدہ نظمیں ہیں۔ زبیر رضوی نے خلیل مامون کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی غزلیں روایتی اور جدید غزل کے دھارے سے مشابہت نہیں رکھتیں۔ زبیر رضوی نے ''آفاق کی طرح'' کی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شاعری وہ بھی ہے جو انسانی حوالوں سے کی جاتی ہے۔ شاعری وہ بھی ہے جو غیر انسانی حوالوں سے بھی ہوتی ہے۔ خلیل مامون کی شاعری میں یہ دونوں کیفیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ڈاکٹر اکرام باگ نے خلیل مامون کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں جو کردار ابھرتا ہے وہ بیک وقت انقلابی بھی ہے اور صوفی بھی۔ اس لیے ان کی شاعری کا رویہ بیک وقت احتجاج اور محرومی سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر خالد سعید نے کہا کہ خلیل مامون کی شاعری مابعد الطبعیاتی عناصر سے بھرپور ہے۔ انفرادی اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ منفرد لب و لہجہ کی شاعرہ محترمہ شائستہ یوسف نے کہا کہ خلیل مامون نے اردو شاعری میں اختر الایمان کے بعد طاری جمود کو توڑنے کی سعی کی ہے ماہر منصور نے خلیل مامون کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس شاعر کی نظموں کو کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کے لیے 37 سال کا عرصہ لگا ہے جو اہل اردو کی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے خلیل مامون ایک ایسا شاعر ہے جس کو پڑھنا چاہیے اور پڑھانا چاہیے۔

جناب وہاب عندلیب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شہر گلبرگہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں اردو زبان و ادب آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے کتابوں کی اشاعت و طباعت کا کام بھی اسی معیار کا ہورہا ہے جو خوشی کی بات ہے انھوں نے اس رجحان کو فروغ دینے میں خلیل مامون کی دلچسپی کو سراہتے ہوئے دیگر ادبا و شعرا کو بھی اپنی تصانیف کی طباعت اور اشاعت کے لیے دعوت دی۔ جلسے کے آخر میں ایک شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت جناب زبیر رضوی نے فرمائی۔ اس شعری نشست میں زبیر رضوی، خلیل مامون، شائستہ یوسف، ماہر منصور، اکرم نقاش، خالد سعید، محب کوثر، ڈاکٹر وحید انجم، نورالدین نور، قاضی انور، ڈاکٹر رزاق اثر، مسعود عابد نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ (منصف، حیدرآباد)

مشاعرے

● نگینہ، 3 نومبر۔ ادبی تنظیم ''انجمن مشعل اردو'' نے ایک شعری نشست کا انعقاد قاضی سرائے میں کیا۔ جس کی صدارت خورشید احمد ناز نے کی اور نظامت کے فرائض نوجوان شاعر بہاؤ الدین بہار نے نبھائے۔ شعری نشست کا آغاز اطہر شکیل کی پیش کردہ نعت رسول سے ہوا۔ بعدازاں درج ذیل شعرا نے غزلیں سنا کر سامعین سے داد حاصل کی۔ فہیم احمد فہیم، عمران ساغر، نعیم احمد رنگ، اطہر شکیل، ڈاکٹر احتشام، بہاؤالدین بہار، فرقان احمد۔

● علی گڑھ، 8 نومبر۔ آذر اکادمی علی گڑھ کے زیر اہتمام ڈاکٹر اسلم حنیف گنوری کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا انعقاد ''ایک شام ڈاکٹر اسلم حنیف کے ساتھ'' کے عنوان سے اردو بورڈ علی گڑھ میں کیا گیا۔ جس کی صدارت بزرگ شاعر قمر اکبر آبادی نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی سنبھل سے تشریف لائے ڈاکٹر طاہر رزاقی نے شرکت کی اور بحیثیت مہمان ذی وقار ڈاکٹر راحت حسن اور ڈاکٹر سید طواب نے مشاعرے کا افتخار بڑھایا۔ نظامت کے فرائض اویس جمال شمسی نے انجام دیے۔ آذر اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر اسلم حنیف کو دوسرے آذر فریدی میموریل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ قمر اکبر آبادی، ڈاکٹر طاہر رزاقی، ڈاکٹر راحت حسن کو بھی اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر معظم علی خاں نے یادگاری نشان پیش کیے۔ ڈاکٹر اسلم حنیف نے آذر اکادمی، مشرف حسین محضر، اویس جمال شمسی کی ادبی خدمات کو سراہا اور اکادمی کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز نعت پاک سے ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان نے کیا۔
درج ذیل شعرا نے غزلیں پیش کیں:

قمر اکبر آبادی، اسلم حنیف گنوری، طاہر رزاقی، معظم علی خان، راحت حسن، ذیشان گنوری، وسیم اختر، الیاس نوید، الحاج طالب محمود، نواب نعمت اللہ شیروانی، اویس جمال شمسی، رضوان الرضا، بابر الیاس، راشد الاسلام، مشرف حسین محضر، آفتاب انجم، بصیر الحسن وفا، مجیب شہزر، جالب سیفی، دانش مارہروی، مبشر قمر فریدی، ہریش بیتاب، عبدالمقیط آغاز، صوفی یوسف ہاتف۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● افضل گڑھ، 8 نومبر۔ بزم سخن کے زیر اہتمام ایک طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ ''میں خود کو مٹانے کی کوشش کروں گا'' مصرعے پر طرحی مشاعرے کی صدارت اردو رابطہ کمیٹی کے صدر مولانا عبدالواسع نے کی جبکہ نظامت ایس ایم اسلم اور ادیب بجنوری نے کی۔ ڈاکٹر اے ایچ صابری نے شمع روشن کی، نعیم جذبی دھامپوری نے نعت پاک سے مشاعرے کا آغاز کیا۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا شریک ہوئے۔ کوثر وارثی، حکیم ظفر علی سنبھلی، عبدالرحیم وفا، شمیم گل، نفیس منظر دھامپوری، شاداب ٹھاکر دوارہ، ارشاد دھامپوری، ایس ایم اسلم، نعیم جذبی دھامپوری، شفقت بھارتی شیرکوٹی، شرافت انصاری، محمد اکرم، ڈاکٹر ناصر سرتاج، شریف بھارتی، ڈاکٹر انور ظہیر احمد، لیاقت ساغر وغیرہ۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں اردو سوسائٹی آسٹریلیا کے زیر اہتمام ایک اردو مشاعرہ منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی آسٹریلیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر جلیل عباس جیلانی تھے جو خاص طور پر کینبرا سے تشریف لائے تھے۔ مشاعرے کی صدارت امریکہ سے تشریف لائی ہوئی شاعرہ نوشی گیلانی نے کی دیگر مہمان شعرا میں لندن سے صفدر ہمدانی، کینیڈا سے اشفاق حسین اور شکاگو سے اشفاق حسین اور افتخار نسیم نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کو ''احمد فراز کے ساتھ ایک شام'' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا تھا لیکن احمد فراز اپنی ناسازی طبیعت کے باعث تشریف نہ لا سکے لیکن ان کی کمی کو ان کی گذشتہ برسوں کی ویڈیو دکھا کر پورا کیا گیا۔

'اردو سوسائٹی آسٹریلیا' کے سکریٹری جنرل سعید خاں نے احمد فراز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ فراز کی شاعری دراصل عوامی جذبات کی ترجمانی ہے اور یہی اس شاعری کی ہدایت کی دلیل ہے۔

وسطی سڈنی کے ایک خوبصورت ہال میں ہونے والے اس مشاعرے میں عاشقان اردو نے شرکت کی جن میں ایک بڑی تعداد خواتین کی تھی یہ مشاعرہ کوئی پانچ گھنٹے تک جاری رہا۔

سڈنی میں مقامی حکومت کی طرف سے مختلف نسلوں کے روابط کی کونسل کی مس انجلی نے اپنے مختصر خطاب میں بیرونی ممالک سے آنے والے شعرا کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ مشاعرے کی اس روایت سے مختلف نسلوں کے قریب آنے میں مدد ملے گی۔ ''اردو سوسائٹی آسٹریلیا'' کے صدر ڈاکٹر شبیر حیدر نے مہمان شعرا کا تعارف کروایا اور انھیں آسٹریلیا میں خوش آمدید کہا۔ تقریب کے دوسرے دور میں مقامی شعرا نے اپنا کلام پیش کیا جن میں ریحان علوی، شاہد ترمذی، نسیم حیدر، فرحت اقبال، عباس گیلانی اور عارف صادق نے حاضرین سے داد وصول کی۔ مشاعرے کی نظامت جناب صادق عارف نے کی۔

(اعتماد، حیدرآباد)

● بہار شریف، 24 اکتوبر۔ نالندہ ضلع کا تاریخی قصبہ استھانواں جو دبستان عظیم آباد کا ایک اہم علمی و ادبی مرکز ہے علم و حکمت کا ہمیشہ سے گہوارہ رہا ہے جس نے ہر دور میں اردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ادھر ایک طویل عرصے سے یہاں علمی اور ادبی مجلسوں کے انعقاد کا

سلسلہ تھوڑا سست پڑ گیا تھا۔ عیدالفطر کے مبارک موقع پر چند نوعمر طلبہ نے اس جمود کو توڑ اور ایک عظیم محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا جو بہت ہی کامیاب رہا۔ 16 اکتوبر کی شب غزلوں اور ایک سے بڑھ کر ایک اشعار سے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ادب نوازرات کی اخیر ساعتوں تک محظوظ ہوتے رہے۔ مشاعرے کا آغاز قاری سید شاہ فیصل حیدر کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد شاہنواز حیدر شمسی نے نعتیہ کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر جناب مسلم ہندی نے کی۔ جبکہ نظامت کی ذمے داری صغریٰ ہائی اسکول انٹرکالج کے پرنسپل ارشد استھانوی کے سپرد کی گئی۔ مشاعرے کے آغاز میں نقیب مشاعرہ جناب ارشد استھانوی نے استھانواں کی علمی ادبی اور تاریخی حیثیت بیان کی۔ انھوں نے یاددہانی کرائی کہ استھانواں نے نہ صرف ممتاز عالم دین پیدا کیے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں یہاں کے لوگوں نے اپنی اہلیت ثابت کی ہے۔ 1938 میں قائم مدرسہ محمدیہ استھانواں نے بے شمار علمی و ادبی شخصیتوں کو پیدا کیا۔ یہاں ادبی سرگرمیوں کی بھی ایک الگ تاریخ رہی ہے۔ نظام حیدرآباد میں وزیر مالیات جناب سید تقی الدین اور بیرسٹر محی الدین نے 1885 میں ایک عظیم الشان لائبریری ''انجمن الفلاح'' اردو لائبریری کی بنیاد ڈالی۔ اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق پروفیسر حسن عسکری، سرسید احمد خاں کے پوتے سرراس مسعود اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم شخصیتوں کی تشریف آوری ہوئی۔ علامہ رونق استھانوی اور شاد عظیم آبادی سے معاصرانہ چشمک رکھنے والے سید عبدالرحیم استھانوی جیسے شاعر اسی دھرتی کے لعل ہیں۔ اسی دھرتی کے لعل کے نام سے منسوب پٹنہ کا بین الاقوامی معین الحق اسٹیڈیم کھیل کے شعبے میں استھانواں کی عظمت بیان کر رہا ہے۔ دور حاضر میں بھی ہونہار باصلاحیت اور ذہین طلبہ کی جماعت استھانواں کی عظمت کو چار چاند لگا رہی ہے۔ جناب ارشد استھانوی نے اقبال کے اس شعر کے ساتھ:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کہا کہ آنے والی نسل بھی استھانواں کی عظمت اور سربلندی کا سلسلہ جاری رکھے گی۔ اپنے ان تعارفانہ کلمات کے ساتھ شاعروں کو زحمت سخن دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ درج ذیل شعرا کے کلام سے سامعین محظوظ ہوئے۔

راہی، تنویر ساکت، وسیم اصغر نالندوی، تنگ ایوبی، عبدالحفیظ حفیظ، اختر پرواز حبیبی، آفتاب حسن شمس، غضنفر عالم ندوی، فصیح الدین فصیح، مسلم ہندی۔ سید حامد جاوید استھانوی کے ہدیۂ تشکر کے ساتھ اس عظیم الشان مشاعرے کا اختتام ہوا۔

● بزم شیدائے ادب متھرا کے زیراہتمام طرحی مشاعرے کا انعقاد اعظمی منزل، منوہر پورہ پر کیا گیا، جس کی صدارت بزرگ شاعر بابو یاسین خاں نے کی۔ نظامت کے فرائض سید محمد حسین اختر نے انجام دیے، بھوپال سے تشریف لائے مہمان شاعر بشر صہبائی اور بحیثیت مہمان خصوصی بھگت سنگھ ورما (ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر) تھے۔ مشاعرے سے قبل متھرا کے مشہور شاعر حاجی محمد احمد خاں تابش نے بابو یاسین خاں شفائی کی دستار بندی بھی کی، بانی بزم سعید اعظمی نے بھگت سنگھ ورما، ہرسروپ چودھری اور بشر صہبائی کا بزم کی جانب سے استقبال کیا۔ (نئی دنیا، دہلی)

● بنگلور، ہفتہ 20 اکتوبر کی شب سول آرٹس سوسائٹی بنگلور کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ بنام ''ایک شام غفران امجد کے نام'' منعقد ہوا۔ صدارت جناب ریاض احمد خمار نے کی۔ مہمان اعزازی جناب غفران امجد بناری اور روزنامہ راشٹریہ سہارا بنگلور کے نائب مدیر جناب جمال الدین سنجر مہمان خصوصی رہے۔ نشست کا آغاز قدیم روایتی انداز میں شمع روشن کرنے کے بعد ہوا۔ موسلا دھار بارش کے باوجود شہر کے دوردراز علاقوں سے شعرا کی آمد اس بات کی غماز تھی کہ اردو کی کشش میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ جناب ریاض احمد خمار نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ شہر بنگلور میں اس طرح کی شعری نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، انھوں نے اندوکانت اثر دہلوی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ زبان کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ زبان علاقائی عصبیتوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس طرح کی نشستوں میں شعرا ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں اور فن پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ فن کے محاسن و معائب پر بات ہوتی ہے۔ صاحب اعزاز شاعر جناب غفران امجد نے کلام پیش کرنے سے قبل شعری نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس اندھیرے کمرے میں روشن شمع کو دیکھ کر یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ واقعتاً ہم اردو شاعری کے اس زریں دور میں پہنچ گئے ہیں جب پورے ہندوستان میں زبان اردو کی آبیاری کے لیے شعری نشستوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ آج وہی ماحول یہاں دیکھنے میں آرہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری، اردو کی ترقی وترویج کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنی زبان کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ حسب ذیل شعرا نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ریاض احمد خمار، غفران امجد بناری، امجد بناری، شیخ حبیب، سہیل چمن پٹن، سید ریاض کیمپاپوری، افتخار ارسل بناری، جمال الدین سنجر، گیان چند مرگیہ، اپتابھ سکینہ ثنا، جناب ابراہیم نفیس نے نظامت کی۔ اندوکانت اثر کے شکریے پر مشاعرہ ختم ہوا۔ (سالار، بنگلور)

ڈاکٹر ابوبکر عباد نے قومی اردو کونسل میں بحیثیت پرنسپل پبلی کیشن آفیسر اپنا عہدہ سنبھالا

ہمیں یہ خبر دیتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سینئر لکچرر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ موصوف گذشتہ پانچ برسوں سے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ تھے اس سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی انھوں نے عارضی لیکچرر کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر ابوبکر عباد کے والد محترم مفتی ظفیر الدین صاحب دارالعلوم، دیوبند کے مفتی اعظم ہیں۔ وہ اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے صدر بھی ہیں اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی رکن بھی۔ ابو بکر عباد صاحب کے چچا مولانا عبدالرحمٰن صاحب امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے پانچویں امیر شریعت تھے۔ ابوبکر عباد صاحب کی تاریخ پیدائش 15 دسمبر، 1968 ہے۔ ان کا تعلق دربھنگہ ضلع کے ایک مردم خیز گاؤں پورا نوڈیہہ سے ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کی۔ اس کے بعد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں قاضی افضال حسین کی نگرانی میں ایم. فل. اور پی. ایچ. ڈی. مکمل کی۔ انھوں نے ایم. فل. کا مقالہ ''ممتاز شیریں کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر لکھا جو'' ممتاز شیریں ناقد اور کہانی کار'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پی. ایچ. ڈی. کا مقالہ ''اردو افسانے کی نظری تنقید'' کے موضوع پر ہے۔ ان کے مضامین اردو کے مؤقر ادبی جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور وہ نئی نسل کے ایک سنجیدہ ناقد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

جناب ابوبکر عباد کے عہدہ سنبھالنے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مرکزی دفتر واقع آر. کے. پورم کے کمیٹی روم میں ایک استقبالیہ محفل کا انعقاد کیا گیا جہاں دفتر کے تمام کارکنان سے ڈاکٹر ابوبکر عباد کا تعارف قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے مخصوص انداز میں کراتے ہوئے کہا کہ تمام دفتر کے ارکان جس دن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے وہ دن آج آ گیا۔ مجھے احساس ہے کہ ایک اہم عہدے پر کسی کے موجود نہ ہونے سے باقی لوگوں پر اضافی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں، آج اس کمی کا تدارک ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ابوبکر عباد جن کا شمار نوجوان نسل کے سنجیدہ اور فعال اکیڈمیشین میں ہوتا ہے قومی کونسل کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے اسٹاف اور اردو سماج کے بیچ خوشگوار ماحول کا حصہ بھی بنیں گے اور اسے مزید بہتر بنائیں گے۔

□□□

تبصرہ و تعارف

● نام کتاب: نشاطِ روح
شاعر: اصغر گونڈوی
صفحات۔ 73، قیمت: 69 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک۔1، آر کے پورم نئی دہلی۔66
مبصر: جاوید رحمانی، 401/2AB، بدھ وہار، نئی دہلی۔ 110067

ہماری نئی غزل کے پیش رووں میں اصغر گونڈوی کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں متضاد تنقیدی رویے ان کے زمانے میں بھی تھے اور اب بھی عام ہیں۔ ایک طرف رشید احمد صدیقی اور ان کے نیازمندوں کا حلقہ تھا جو بہ اصرار اصغر کو بڑا اور اہم شاعر بتاتا تھا تو دوسری طرف نیاز فتحپوری اور ان کے شاگردوں کو اصغر کو شاعر ماننے میں بھی تامل تھا۔ نیاز فتحپوری نے اصغر کے مجموعۂ کلام "سرودِ زندگی" کے بارے میں لکھا ہے:

"اصغر صاحب کی شاعری کا بھی اکثر حصہ اسی قسم کا ہے کہ اگر کسی کو تصوف کے مدارج عالیہ حاصل نہ ہوں تو اس بدنصیب کو ہمیشہ اپنے قصورِ فہم کا اعتراف کرنا پڑے گا اور باوجود انتہائی کوشش کے وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے گا جو الفاظ کے اندر محصور ہو کر شاید کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتی...... الغرض یہ جھاڑ پھونک والی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی اور باوجود انتہائی غور و فکر کے آج تک اس کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا"۔

اس تبصرے میں نیاز نے یہ بھی لکھا تھا کہ "نشاطِ روح" میں بھی اس طرح کے اشعار کی کمی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں انھوں نے تصوف کے زیادہ بلند مدارج طے کر لیے ہیں۔ نیاز فتحپوری کے بعد سردار جعفری نے بھی اصغر پر اسی طرح کا اعتراض کیا اور ان کی متصوفانہ شاعری کو بے وقت کی راگنی بتایا۔

گویا کہ مجموعی طور پر اصغر کی شاعری کو صوفیانہ ہی تصور کیا گیا۔ حالانکہ میں اردو کی صوفیانہ شاعری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا ہم خیال ہوں جو درد پر اپنے معرکہ آرا مضمون میں صوفیانہ شاعری کے کچھ خواص متعین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اردو میں صوفیانہ شاعری کا وجود ہی نہیں ہے۔

جہاں تک اصغر گونڈوی کی شاعری کا تعلق ہے تو ان کی جو غزل ہماری حسیت کا حصہ ہے۔ ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہے اس کو بھی صوفیانہ کہنا مشکل ہے۔ وہ غزل ہے:

آرام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی
جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

مجبورئ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

اس غزل کے کئی شعر نیاز صاحب کی زد میں آئے۔ مثلاً آخری شعر کے پہلے مصرعے میں نیاز کے بقول "اس" بالکل غیر ضروری ہے۔ تیسرا شعر نیاز فتحپوری کے بقول مہمل ہے اس لیے کہ کس کو گلستاں بنا دیا اس کی صراحت نہیں کی گئی اور بظاہر کلیوں کو گلستاں بنانے کا ذکر معلوم ہوتا ہے اور کلیوں کا گلستاں بننا مہمل سی بات ہے۔ چوتھے شعر کے بارے میں نیاز نے لکھا:

"یہ شعر بھی بالکل بے معنی ہے، کیونکہ ایمان کی حقیقت یہ بتانا کہ وہ فی الاصل کفر ہے۔ عجیب بات ہے علاوہ اس کے بسیط حقیقت کہنا بھی حد درجہ لغو توجیہہ ہے۔"

اس اعتراض میں شعری صداقت اور فلسفیانہ صداقت کے فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر پر جو اعتراض ہے وہ شعری زبان کو اس کے استعاراتی ابعاد سے الگ کر کے دیکھنے کا کرشمہ ہے اگر شعر میں مستعمل الفاظ کو خالص لغوی اور محاوراتی مفہوم میں استعمال کریں تو ہماری کلاسیکی شاعری کا بڑا حصہ ایسی تنقید کی تاب نہ لا سکے گا۔ پانچویں شعر کے بارے میں نیاز نے لکھا:

"پہلے انھوں نے رازِ زندگی 'خودی کا کفن' بتایا اس کے بعد تلاشِ سراب ظاہر کیا اور اب مجبوری میں پنہاں بتاتے ہیں جس کا دوسرا نام ان کے یہاں روزنِ زنداں بھی ہے۔"

نیاز نے اس شعر کے دونوں مصرعوں کو دولخت بھی بتایا۔ اگر شعر کی تنقید میں نثر کی منطق سے کام لیں تو ایسی ہی بوالعجبیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیاز نے اصغر کو صوفی شاعر تسلیم کر لیا ہے اور چونکہ صوفیانہ شاعری کے وہ قائل نہیں اس لیے اصغر کی شاعری میں کیڑے نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ یہ اصغر کے مجموعے "سرودِ زندگی" کی اچھی خاصی غزل ہے۔

غورطلب مسئلہ یہ ہے کہ جو شاعر انسان کو ان شورشوں سے تعبیر کرتا ہو، جن سے کلام جہاں عبارت ہے اس کو صوفی شاعر کہنا کیا ممکن ہے؟ میرا جواب ہے کہ نہیں! کیونکہ صوفیانہ شاعری میں تو بنیادی اہمیت اپنی ہستی کو کسی بلند تر ہستی میں ضم کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ اصغر نے ایک جگہ اور اسی مضمون کو برتا ہے وہاں کچھ صوفیانہ رنگ البتہ ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن یہ آسانی نہیں بلکہ بمشکل، وہ شعر ہے:

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشت خاک زیر آسماں رکھ دی

اصغر کی زندگی میں تصوف کا رنگ خواہ جتنا بھی رہا ہو، ان کی شاعری کو اس کا پابند کرنا درست نہیں۔ ان کے شعروں میں اگر کچھ صوفیانہ ہے تو اسے برائے شعر گفتن ہی سمجھنا چاہیے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ غزل کے اچھے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں کلاسیکی رچاؤ بہت ہے جو ایک عمر کی ریاضت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا
زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا
نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی
مستانہ کر رہا ہوں رہ عاشقی کو طے
کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے
کھلتے ہی پھول باغ میں پژمردہ ہو گئے
جنبشِ رگِ بہار میں موجِ فنا کی ہے
ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
عاشقی کیا ہے ہر اک شے سے تہی ہو جانا
اس سے ملنے کی ہے دل میں ہوسِ خام ابھی

ان اشعار میں مابعد الطبیعیاتی فلسفے کی دریافت اگرچہ ناممکن نہیں لیکن یہی ان کی کل کائنات نہیں بلکہ ان شعروں کی جمالیاتی تعبیر ان سے الگ ہٹ کے بھی کی جا سکتی ہے اور اس کی روشنی میں یہ عشقیہ وارداتوں کے خوبصورت مرقعے ہیں۔

گویا کہ اصغر کی شاعری کا مطالعہ ہمیں ان کے مروجہ Streo- type سے آزاد ہو کے کرنا چاہیے اور اس صورت میں بھی اصغر کی غزلیں ہماری اردو شاعری کا اہم حصہ ہیں۔ "نشاطِ روح" اصغر گونڈوی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس کو اصغر کی زندگی میں ہی مرزا احسان احمد نے اپنے مقدمے اور اقبال سہیل کے تبصرے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے بعد 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے یہ مجموعہ شائع ہوا اور اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے یو. پی. اردو اکادمی کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔ امید ہے کہ اردو دنیا میں اس ایڈیشن کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

● **نام کتاب: قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ**
مصنف: کاوش بدری
ترتیب و تہذیب: پروفیسر فیضان اللہ فاروقی
صفحات: 176، قیمت۔ 98 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم نئی دہلی۔66
مبصر: شعیب رضا، 36-1/135، سی. پی. جے. بلاک، نیو سیلم پور، دہلی۔53

"قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ (جلد اول- عربی) 176 صفحات پر محیط ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے 2004 میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کی سیریز میں شائع کر کے اردو دنیا میں جنوبی ہند کے ساحلی خطے کو بطور گہوارۂ ادب روشناس کرانے کی مثبت پہل کی ہے۔

اس کتاب کا ابتدائیہ ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے لکھا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ" کاوش بدری نہ صرف شاعری بلکہ نثر میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور وہ تامل ناڈو کے ممتاز ادیبوں اور محققوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔" کتاب کا مطالعہ اس دعوے کی تائید کرتا ہے۔ کتاب تین مستقل ابواب اور چھ ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔ 52 صفحات پر محیط پہلے باب میں موصوف نے تامل ناڈو کی جغرافیائی حدود، عربی مدارس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ، خانقاہی درس گاہی نظام، تامل ناڈو میں قدیم عربی کتب، مخطوطات و کتب خانے، عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی پس منظر، گھریلو مدارس و مکاتب، اساتذۂ کرام کے اسمائے گرامی، بیرونی ممالک کے علما، ادبا، شعرا، تامل ناڈو میں مدرسوں کی تاسیس اور انگریزی تعلیم کی مخالفت، فورٹ سینٹ جارج مدرسہ کالج کا قیام، موجودہ عربی مدارس، تامل ناڈو میں عربی، فارسی اور اردو کے فروغ کے لیے

انگریزوں کی خدمات اور اس کے مقابل علما کی جماعت، مذہبی گروہ بندیاں اور عرب تامل مشترکہ "تمسل" رسم الخط کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف رقمطراز ہیں کہ :

"ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں اسے ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے کہ رومن اردو کی طرح عربی زبان کو تمل زبان کے رسم الخط میں لکھنے کا رواج صرف تمل ناڈو میں رائج ہوا اور اس رسم الخط میں لکھی ہوئی عربی زبان کی شعری اور نثری تخلیقات اور کتابوں کو "عرب تمسل" زبان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ عرب تمسل عربی آمیز تمل زبان ہے۔" (ص۔520)

اس باب کے ایک ذیلی باب "تامل ناڈو میں عربی زبان و ادب کے فروغ کا تاریخی پس منظر" میں ستیارتھ پرکاش کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "مہا بھارت میں کوروں نے جب لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوں کو اس کے اندر پھونک دینا چاہا تو وِدُر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر نے عربی زبان میں جواب بھی دیا تھا"۔ (ص نمبر۔13)

دوسرا باب جو 60 صفحات پر محیط ہے اس میں "تذکرۂ علمائے کرام" کے عنوان سے 24 علما کا ذکر ہے۔

کاوش بدری نے اس باب میں نہ صرف تحقیق بلکہ تاریخ کا بھی حق ادا کیا ہے۔ جن شخصیتوں کا اس میں ذکر ہے ان میں سے بعض کے کراماتی قصے بھی مشہور ہیں لیکن انھوں نے ان سے قطع نظر صرف علمی شواہد یکجا کر دیے ہیں جیسے "گیان بھنڈاری، حضرت مخدوم عبدالحق ساوی المعروف بہ حضرت دستگیر صاحب مدراسی المتوفی 1165ھ/1751 کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اپنے دور میں موصوف کا مدمقابل علم تصوف میں کوئی نہ تھا۔ علم تصوف میں بعض اہم اصطلاحات مثلاً "غیریت حقیقی" آپ ہی کی ایجاد ہے۔ یونانی طب، سائنس کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور دراوڑی زبانوں پر موصوف کو یکساں قدرت حاصل رہی۔" کاوش بدری نے ان علما کا تعارف کراتے ہوئے ان کی تصانیف اور نظریات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین و رسائل کی فہرست بھی پیش کی ہے اور یہ بھی اطلاع فراہم کی ہے کہ یہ چیزیں اب کہاں محفوظ ہیں۔

تیسرا باب 340 صفحات پر محیط ہے جس میں تامل ناڈو کے اہم مدارس، ان کی اجمالی تاریخ اور ادبی رسائل و مجلات کی تفصیل فراہم کی ہے۔ اسی باب میں ذیلی باب کے تحت مدرسہ باقیات الصالحات کے ذیل میں 15 بزرگوں کا تعارف کرایا ہے جس میں افضل العلما پروفیسر حافظ محمد یوسف کوکن عمری، شمس العلما عبدالوہاب شاہ قادری، مولانا عبدالجبار، مولانا ضیا الدین امانی، شیخ الادب مولانا عبدالصمد علی باقوی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، سید حسین شاہ حقیقت وغیرہ شامل ہیں۔ شمس العلما عبدالوہاب شاہ قادری بانی باقیات الصالحات کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آپ کا شمار حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی طرح اکابر مصلحین امت اور مجددین وقت میں ہوتا ہے۔ مولوی عبدالصمد باقوی کی مثنوی سمنستان میں فاتح باب علم مولانا عبدالوہاب کو بلا مبالغہ مجدد جنوب سے خطاب کیا گیا ہے۔ مولانا فدوی باقوی نے بانی باقیات کی مختصر سوانح حیات کا نام "مجدد جنوب" دے کر اپنے ذوق انتخاب کا صحیح ثبوت دیا ہے۔"

اس باب میں ایک اہم حصہ فہرست مخطوطات کا بھی ہے جسے دیکھ کر کاوش بدری کی محنت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جبکہ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ یہ مخطوطے ایسی جگہ ہیں جہاں نہ تو باضابطہ کیٹلاگ بنے ہیں اور نہ ہی جدید لائبریری سائنس سے واقف لوگ بیٹھے ہیں۔ ایسے میں موصوف نے جن کاوشوں سے یہ مواد حاصل کیا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آج جب ہم 1857 کا جشن منا رہے ہیں اور اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ پہلی جنگ آزادی کے وقت سارے ہندوستان میں قومی یکجہتی کا بول بالا تھا اور پھر سے اس کھوئی وراثت کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے، ایسے میں اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ زبان اردو کے خمیر میں رواداری اور صلح جوئی کا جو عنصر شامل ہے اس کی کامیابی میں عربی و فارسی کے ان ممتاز اہل دانش و بینش کا بھی حصہ ہے جنھوں نے مدرسوں میں، خانقاہوں میں یا اپنی نجی محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھ کر مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھانے والے ادب کی پرورش و پرداخت کی اور اردو زبان و ادب نے ان ملفوظات، مکتوبات، رسائل و جرائد نیز مجالس کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کیا ہے۔

کاوش بدری قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس اہم کام کو انجام دیا۔ کلاسیکی ادب پر ریسرچ کرنے والے طلبہ یقیناً اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

● نام کتاب: تعلیمی تشکیل نو کے مسائل/خواجہ غلام السیدین
ترجمہ: ایم. ابوبکر
صفحات: 307، قیمت۔ 96 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔
مبصر: احمد کفیل، E-301، برہم پتر ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی۔67

"تعلیمی تشکیل نو کے مسائل" ماہر تعلیم مرحوم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ مختلف اوقات میں تعلیم و تدریس کے مختلف مسائل و موضوعات پر

لکھے گئے ان مقالوں کو موصوف نے الگ الگ اکیس ابواب میں منقسم کیا ہے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تعلیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسکول اور مدرسے کی تعمیر وتشکیل سے لے کر اس کی زینت وآرائش اور بچے کی انفرادی صلاحیتوں کی تخلیقی تربیت وتعلیم کس نہج پر موزوں ومناسب طور پر کی جاسکتی ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ تعلیمی اصلاح در اصل سماجی اصلاح اور اس کی جدید تعمیر و تشکیل کے مترادف ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی چار صفحات میں خواجہ غلام السیدین نے اپنے تجربات ومشاہدات کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور پھر ابواب کی تقسیم کے ساتھ مقالات کی ترتیب قائم کی ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں — اسکول ایک سرگرم ماحول، اسکول ایک تخلیقی ماحول، اسکول جماعتی زندگی کے مرکز کی حیثیت سے، تعلیم برائے مسرت، التماس برائے وسیع النظری، گاؤں میں تعلیم کا رول، بیسک تعلیم کی دین، ثانوی تعلیم کو کام کے ذریعے حیات تازہ بخشیے، ثانوی تعلیم کی تشکیل جدید، قومی زندگی میں سماجی تعلیم کا مقام، تعلیم بالغاں جمہوری شہریت کے لیے، عمدہ شہریت کی تعلیم، تعلیمی نظم ونسق کی بنیاد انسانیت آموزی کے اصول پر، پیشے کا انتخاب، سماج میں معلم کی حیثیت، معلمین کی تعلیم وتربیت کا ایک نیا نظریہ، معلمین کی ٹریننگ کے بعض مسائل، تعلیمی نشاۃ الثانیہ اور معلم کا فرض، معلم اور ان کی دنیا اور سماجی تربیت کا ایک تجربہ۔

کتاب کے ان مشمولات پر نگاہ ڈالنے سے بھی مصنف کے مشاہدات اور وسعت نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ غلام السیدین کو تعلیم وتدریس اور اس کے جملہ مسائل سے گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنے دفتری کاموں کے ساتھ تعلیمی امور کی جانب بھی اپنی پوری توجہ کی۔ اس سے قبل ان کی کتابیں ''اصول تعلیم'' اور ''مستقبل کا مدرسہ'' جب منظر عام پر آئی تھیں تو انھیں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی اضافی کڑی ہے جس میں انھوں نے ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک کے ذہنی سطح کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اسکول کے ماحول کی جدید تشکیل کے کیا تقاضے ہیں نیز طلبہ کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما بہتر طور پر کس طرح کی جاسکتی ہے۔

موجودہ دور میں تعلیمی، مادی اور سماجی واخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جا رہی ہے وجہ یہ ہے کہ ہم ان مفروضات کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن محاسبہ، تجزیے اور عمل سے عموماً راہ فرار اختیار کرتے ہیں، زیر تبصرہ کتاب ان نکات کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتی ہے اور کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

قومی اردو کونسل نے اس نوعیت کی بہت سی عمدہ کتابیں شائع کی ہیں جن میں ''تعلیم، سماج اور کلچر'' از اختر انصاری، ''تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر'' از ڈاکٹر سلامت اللہ، ''تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری'' از عبدالغنی مدہوش، ''اصول تعلیم'' از خواجہ غلام السیدین، ''تعلیم کی نفسیاتی کتابیں'' ترجمہ از عبداللہ ولی بخش قادری، اور ''تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں'' از ایس۔ ایم۔ جعفر وسعید انصاری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تعلیمی نوعیت کی ان اہم کتابوں میں خواجہ غلام السیدین کی کتاب ''تعلیمی تشکیل نو کے مسائل'' ایک ایسی کتاب ہے جو اگرچہ اصلاً معلمین کے لیے لکھی گئی ہے مگر اس کا خطاب ان تمام لوگوں سے ہے جو مستقبل کی تعلیم کو صحیح رخ دینے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

● **نام کتاب: عزیز اباظہ کے منظوم ڈراموں کا تنقیدی جائزہ**
مصنف: ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد
صفحات: 320، قیمت۔ 200 روپے
تقسیم کار: ادبی دنیا، 510، مٹیا محل، دہلی-6
مبصر: ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کسی زمانے میں مذہبی علماء اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ لازم وملزوم تھے۔ گو کہ ان کی تصنیفات عقائد وفلسفے، مذہب ومعاشرت، فقہی مسائل کی توضیحات وتاویلات اور تصوف واخلاق سے متعلق ہوتی تھیں لیکن شعر وادب اور تحقیق وتنقید کی دنیا میں بھی علماء کی خدمات کچھ کم نہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحلیم شرر، مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولوی وحید الدین سلیم، علامہ نیاز فتح پوری، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی وغیرہ ایسی نابغۂ روزگار شخصیات ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو زبان وادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جاسکتی۔ بعد میں علمائے کرام کا عمل دخل شعر وادب کی دنیا سے بتدریج کم ہوتا گیا اور انھوں نے خود کو اپنی ایک مخصوص دنیا میں محصور کر لیا۔

ایک مدت کے بعد مفتی مکرم احمد صاحب کی صورت میں کسی عالم دین کا اس حصار سے باہر آنا اچھا لگا۔ اور یہ مسجد فتح پوری دہلی کے پیش امام اور قال اللہ وقال الرسول کی تدریس میں مصروف ایک عالم دین کی ادب کی دنیا میں آمد ایک خوشگوار واقعہ ہے۔

ڈاکٹر مفتی مکرم احمد صاحب نے یہ کتاب عربی ڈراما نگار عزیز اباظہ کے دس منظوم ڈراموں کے تعارف وتجزیے کے مقصد سے لکھی ہے۔ یہ کتاب اظہار تشکر، پیش لفظ اور مصادر ومراجع کے علاوہ چار ابواب اور گیارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس میں ڈرامے کی عمومی تعریف وتقسیم سے لے کر عربی ادب میں منظوم ڈرامہ نگاری کے مستقبل تک، تمام پہلوؤں پر سیر حاصل

گفتگو کی ہے۔

ممالک عرب میں یونان و ہندوستان اور فرانس وانگلستان کی طرح ڈرامے کی روایت نہ تو قدیم ہے، اور نہ سوفو کلیز، شیکسپیر، کالی داس، بیکٹ، بریخت یا ابسن جیسا کوئی بڑا ڈرامہ نگار وہاں پیدا ہوا۔ لیکن توفیق الحکیم، الاستاذ فتوح نشاطی، صقر الرشید، فہمی محمد رجزی، سمیر شقانی، عمر ابو نصر، مہدی ابو قرین، علی احمد باکثیر، عزالدین مدنی اور احمد شوقی جیسے استادانِ فن نے اس ادبی صنف کے گیسوؤں کو تابدار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ انھیں میں سے عزیز اباظہ بھی ہیں جنھوں نے 'قیس ولبنی، العباسہ، الناصر، شجرۃ الدر، غروب الاندلس، شہریار، اوراق الخریف، قافلۃ النور، قیصر، اور زہرہ جیسے منظوم ڈرامے لکھ کر مقبولیت حاصل کی، گوکہ اس سے پہلے ان کی شاعری کا دیوان اور اپنی بیوی کا مرثیہ انھیں شہرت دلوا چکا تھا۔

مفتی محمد مکرم احمد صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عزیز اباظہ کو اردو میں متعارف کرایا اور اس حوالے سے عربی ڈرامے کی تاریخ، عربی میں منظوم ڈرامے کی روایت اور ضمناً اس کے حال و مستقبل پر روشنی ڈالی۔ کتاب کا چوتھا باب سب سے اہم ہے کہ اس باب میں مصنف نے عزیز اباظہ کے ڈراموں کی نہ صرف تلخیص بیان کی ہے بلکہ ان سب کا دیانت داری سے تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ انھوں نے بڑے متوازن طریقے سے ان ڈراموں کی خوبیوں کو بھی سراہا ہے اور ان کے نقائص کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اس باب میں مفتی مکرم احمد صاحب کا تنقیدی جوہر کھل کر سامنے آیا ہے جو فن ڈرامہ نگاری پر ان کی دسترس اور ان کے وسیع مطالعے کا احساس کراتا ہے۔

لیکن اس کتاب میں ایک بڑی کمی ہے۔ وہ یہ کہ مصنف نے کتاب میں منقول عربی اشعار اور ڈراموں کے عربی مکالموں کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ فی زمانہ اردو قارئین کی تعداد بمشکل ایک فی صد ہوگی جو بغیر ترجمے کے عربی اقتباسات واشعار سمجھ سکے۔ اسی طرح باب چہارم کی تیسری فصل کا عنوان ہے، 'عزیز اباظہ کے فن پر اسلامی اثرات'۔ اس میں مصنف نے یہ نشان دہی کی ہے کہ ان کے ڈراموں میں کہاں کہاں قرآن شریف کی آیات استعمال ہوئی ہیں اور اباظہ کس طرح مختلف آیات کی تفسیر اپنے اشعار اور مکالمے کے ذریعے کرتے ہیں، لیکن کہیں بھی نہ تو آیاتِ کریمہ کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے اور نہ ہی اشعار و اقوال کا۔ اگر فاضل مصنف نے ان عبارات کا اردو ترجمہ بھی دیا ہوتا تو کتاب زیادہ مفید ثابت ہوتی۔ بہر حال، عربی ادب سے دل چسپی رکھنے والے اردو قارئین کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔

● **نام کتاب: دوسری زندگی**
شاعرہ: یاسمین حمید
صفحات: 700، قیمت۔ 750 روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر 3، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی
مبصر: ڈاکٹر نجمہ رحمانی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ 110007

تانیثی ادب کی ممتاز شاعرات میں یاسمین حمید کا نام اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں لہجے کی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مدھم سروں کی لے ہے جس کے ذریعے وہ تجربے کو احساس میں ڈھالنے کے نازک فن کو کامیابی کے ساتھ برتتی ہیں۔ معاصر شاعرات میں وہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔ لہٰذا وہ شاعرات پر کیے جانے والے اس اعتراض کی بھی نفی کرتی ہے کہ شاعرات کے موضوعات کا دائرہ گھر آنگن تک محدود ہوتا ہے۔ ''پسِ آئینہ'' سے ''فنا بھی ایک سراب'' تک ان کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ نئی جہات کی جانب ایک مسلسل سفر کا اشارہ ملتا ہے۔ 1988 میں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا منظر عام پر آیا تو شعر کے قاری کو ان سے توقعات وابستہ ہوگئیں۔ اس مجموعے میں بہ حیثیت عورت ان کی حسیت کا پر حکمت اظہار تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے تین مجموعے ''حصار بے در و دیوار'' (1991)، ''آدھا دن اور آدھی رات'' (1996)، اور ''فنا بھی ایک سراب'' (2001) شائع ہوئے۔ پانچواں مجموعہ ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' ابھی زیر ترتیب ہے۔ پچھلے شائع شدہ چاروں مجموعوں پر مشتمل کلیات ''دوسری زندگی'' ابھی چند دن قبل ہی قارئین تک پہنچی ہے۔

یاسمین حمید کی شاعری نسائی حسیت کا ایک نرم اور خاموش اظہار ہے۔ یہ شاعری محرومی، تنہائی اور تشنگی کا نوحہ نہیں، کسک ہے۔ زندگی سے مکالمہ اور امکانات کی تلاش کے ساتھ ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نا آسودگی، بیچارگی کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ احتجاج کی دبی ہوئی لے بن کر ابھرتی ہے اور وارداتِ قلب، احساس و تجزیے کے عمل سے گزر کر شاعرانہ سطح پر جلوہ گر ہوتی ہے جس کی ترسیل کے لیے یاسمین حمید ندی کی سبک رفتار موجوں کی طرح بہتے ہوئے الفاظ کا سہارا لیتی ہیں:

ہمیں خبر تھی بچانے کا اس میں یارا نہیں — سو ہم بھی ڈوب گئے اور اسے پکارا نہیں
بری تھا منزلوں کی جستجو سے — جو دشتِ ذات کا اندھا سفر تھا
تھا میری فکر کا شیشہ سلامت — بہت حیران ایک آئینہ گر تھا
کہیں مکان و کہیں آندھیوں کا رزق بنیں — کہیں چراغ جلانے کو بھی ہوا نہ ملے

ان کے یہاں جذبات واحساسات کی تطہیر سے عمل میں آنے والا ایک

آہنگ ہے اور ایک صیقل شدہ خود کلامی ہے۔ وہ جس سلیقہ شعاری اور سبک خرامی سے احساس کی کائنات سجاتی ہیں وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس شاعری میں دل و دنیا اس طرح باہم نظر آتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ عشق سے سیاست تک روشنی اور اندھیرے کی حدیں ایک دوسرے میں کہیں مدغم ہوتی تو کہیں متوازی خطوط پر حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ "تیرے طلسمی شہر میں" "ہمیں سچ بولنا ہے" "سیاہی اوڑھنے والی" "سنو اے داستاں گو" جیسی بہت سی نظمیں اپنی وسعتِ فکر کے باعث قاری کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرتی ہیں۔ ان نظموں میں سیاست کی آلودگی، سماج کی سفاکی، آرائشِ گیتی کی آرزو، تضاد و کشمکش اور رعنائی خیال کے دھندلے منظر تک ہر انداز شامل ہے:

قلم سا ظلم
کہ جس کی کوئی حد ہے نہ شروعات کہیں
اب مجھے بھول رہا ہے کہ وہ دن کون سا تھا
جب مجھے یہ معلوم ہوا تھا
کہ کسی سچ میں کوئی وزن نہیں
عدل کے بھی کئی مفہوم ہیں اور
ظلم کی طرح سزا کی کوئی میعاد نہیں

دیدہ زیب سرورق اور 700 صفحات پر مشتمل یہ کلیات یاسمین حمید کے شعری سفر کی وہ داستان ہے، جس میں لوح سے تحت تک ایسے کئی مقام آتے ہیں جو پڑھنے والے کے دامنِ نظر کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ اس کلیات کے ذریعے ایک باذوق قاری یاسمین حمید کی جہات کا شریک ہو سکتا ہے۔

● قلم اور قلم کار/ شاغل ادیب

صفحات: 128، قیمت۔ 100 روپے

ناشر: نیرنگ ادب پبلی کیشنز، زیب منزل، صدیق نگر، مشیرآباد، حیدرآباد۔ 500048

مبصر: ایاز احمد، 230، ستلج ہاسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔ 67

شاغل ادیب شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی برابر لکھتے رہے ہیں۔ ان کے سات شعری مجموعے اور چار نثری کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان کی یہ تازہ ترین نثری تصنیف "قلم اور قلم کار" ہے جس میں مختلف ادبی شخصیات پر مضامین کے علاوہ مختلف اصناف ادب سے متعلق کتابوں پر تبصرے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین اس لحاظ سے زیادہ اہم ہیں کہ یہ ان تخلیقی فنکاروں کے بارے میں ہیں جن کے کام کا اعتراف بہت کم ہوا ہے۔ شاغل ادیب کو اس کمی کا احساس ہوا تو انھوں نے یہ مضامین سپرد قلم کیے۔

شاغل ادیب کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ فنکاروں کی حیات کا خاکہ پیش کرنے کے بعد اس کے نظریۂ حیات کی روشنی میں اس کے فن کا جائزہ لیتے ہیں، گویا وہ فن کو فنکار کی زندگی کا عکس اور اس کا ترجمان خیال کرتے ہیں۔

"قلم اور قلم کار" کا پہلا مضمون "پروفیسر محمد علی اثر بہ حیثیت ماہر دکنیات" ہے۔ دکنی ادب کی تحقیق و تنقید میں محمد علی اثر نے جو کام انجام دیے ہیں اس کا اعتراف شاغل ادیب ان الفاظ سے کرتے ہیں، "عصر حاضر میں دکنیات کی تحقیق، تدوین، تنقید میں جو سب سے نمایاں اور بلند شخصیت نظر آتی ہے وہ پروفیسر محمد علی اثر کی ہے"۔

دوسرے مضمون میں انھوں نے صلاح الدین نیر کے تاثراتی مضامین کے حوالے سے ان کی تنقیدی فہم پر روشنی ڈالی ہے جبکہ تیسرے مضمون میں ریاست علی تاج کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے راج بہادر گوڑ سے کلی طور پر اتفاق کیا ہے کہ "تاج کی غزل پرانی بوتل میں نئی شراب ہے۔"

چوتھے مضمون میں اشرف افتخاری کی شخصیت پر اظہار خیال ہے جبکہ پانچویں مضمون میں جمیل نظام آبادی کی غزل گوئی کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ چھٹا مضمون "ابو الفیض سحر مرحوم" کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ ہے۔ مصنف نے ان کو عصر جدید کا ولی اورنگ آبادی کہا ہے۔ دیگر مضامین میں کچھ معروف اور غیر معروف شاعروں کے کلام پر اظہار خیال ہے۔

ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاغل ادیب کا مطالعہ وسیع ہے۔ کلاسکی ادب پر ان کی نظر ہے تو وہ ترقی پسند تحریک کے نظریات سے بھی آشنا ہیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے قصے کی بھی انھیں خبر ہے لیکن وہ خود کسی نظریے کے علم بردار نہیں۔

مضامین کے علاوہ "قلم اور قلم کار" میں بارہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ پہلا تبصرہ انجم عارفی کے مجموعۂ کلام "انجم زار" پر ہے۔ دوسرے پروفیسر محمد علی اثر کے حمد اور نعتوں کے مجموعے پر، رشید احمد جلیلی کے شعری مجموعے کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف اصناف کی کتب ہیں جن پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

شاغل ادیب کا اسلوب بیان سادہ ہونے کے باوجود مترادف جملوں کے استعمال نے سادگی کو پیچیدگی میں تبدیل کر دیا ہے۔ پروف کی غلطیاں بہت ہیں جن سے کہیں کہیں قاری کے اندر اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ □

جلیل عشرت

پرندے کہاں گئے؟

کلاس کی الیکٹرانک گھنٹی ٹھیک وقت پر بج اٹھی تمام بچوں کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی چھٹی ہی چھٹی، کل سنیچر ہے تو پرسوں اتوار، مستی ہی مستی۔

اسکول گیٹ سے نکل کر احتشام اور عادل دوڑ کر گراؤنڈ کی طرف بھاگے جہاں روزانہ اسکول بس کھڑی رہتی تھی۔ کھڑکی کے پاس والی سیٹ حاصل کرنے کے لیے تھوڑی جد وجہد بچوں کے درمیان رہتی ہے۔

مگر یہ بات سن کر دونوں دوست ڈھیلے پڑ گئے کہ آج یہ بس نہیں جائے گی اس میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے تا وقتیکہ دوسری بس نہ آجائے۔ بچوں کو انتظار کرنا پڑے گا۔

احتشام نے عادل سے پوچھا ''تمھارے پاس موبائل ہے؟ جلدی میں آج اپنا موبائل لانا ہی بھول گیا۔ امی کو اطلاع دے دیں کہ گھر پہنچنے میں ذرا دیر ہوگی۔ '' نیک خیال ہے'' عادل نے اسکول بیگ سے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

اپنے اپنے گھروں میں فون کرنے کے بعد دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ عادل سڑک کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے احتشام سے مخاطب ہوا '' بس کا کوئی بھروسہ نہیں چلو پیدل ہی گھر چلتے ہیں۔''

''نہیں۔نہیں ۔ عادل گھر پر جھاڑ پڑے گی۔ ساتھ ہی مجھے ڈر بھی لگتا ہے یہ اونچی اونچی عمارتیں ، لمبی لمبی سڑکیں، اور نئے نئے ماڈل کی دندناتی پھرتی گاڑیاں .... احتشام نے سنجیدگی سے کہا۔

'' بابو احتشام ہمارے اندر بھروسہ آخر کب آئے گا ہم لوگ بہادر اور دلیر کیسے بن پائیں گے ۔ ہم دونوں ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں تم نے کبھی سوچا ہے سات دن میں تو بلی کے بچے بھی اپنی آنکھیں کھول لیتے ہیں'' عادل کا طنز کام کر گیا۔

احتشام نے گھبرا کر کہا'' چل میرے بھائی چل ....

دونوں خوشی خوشی اپنے گھر کی جانب پیدل چل پڑے۔ راستے میں احتشام نے عادل سے پوچھا'' یار ہمارے شہر سے سارے پرندے کہاں چلے گئے؟ ہاں جب ہم چھوٹے تھے تو چیل، کوے، کبوتر، مینا، ہدہد، گوریئے اور طوطے آسانی سے جہاں تہاں نظر آجاتے تھے مگر اب تو کبھی کبھار دکھتے ہیں۔ آخر پرندے گئے کہاں۔؟'' عادل نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

'' شاید کچھ تو ہجرت کر گئے اور کچھ حادثوں کا شکار ہو گئے'' احتشام نے سمجھ داری دکھانے کی کوشش کی ۔

تم نے دور درشن پر دیکھا ہوگا کہ شہر میں کثافت (Pollution) بڑھتی ہی جا رہی ہے۔'' ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو'' عادل بولا یہ کمپیوٹر، نیٹ ورک، ٹیلی فون اور موبائل کا زمانہ ہے اور شہر میں جگہ جگہ کھمبے اور تار لگا دیے گئے ہیں جن سے الیکٹرانک لہریں نکلتی ہیں۔

شاید ان کا اثر پرندوں پر بھی پڑتا ہو اس لیے بیچارے پرندے گاؤں، دیہات کی طرف بھاگ گئے ہوں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' احتشام نے عادل کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اچھا' کل تو چھٹی ہے۔تم صبح ناشتہ کر کے میرے گھر چلے آؤ باغ چلیں گے۔ مجھے ایک طوطا پکڑنا ہے۔ مٹھو کے مرنے کے بعد کب سے پنجرہ خالی ہے اور تنہا گھر میں کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے جس سے کھل کر بات چیت کی جائے۔'' عادل بولا'' چھوٹا پریوار، سکھی پریوار۔'' احتشام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں کے مکان ایک ہی محلے میں تھے۔ گپ شپ کرتے کرتے اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔

پروگرام کے مطابق احتشام دوسرے دن ٹھیک وقت پر عادل کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں غلیل اور جیب میں مٹی کی گولیاں تھیں۔ عادل، احتشام کو دیکھتے ہی کھل اٹھا اور اپنی ماں سے کچھ کہتے ہوئے ایک جھولا اٹھایا اور بولا'' چلو''۔

موسم خوشگوار تھا۔ باغ میں پرندے چہچہا رہے تھے اور ایک ڈال سے دوسری ڈال پر اڑ کر جا رہے تھے۔ کچھ ایسے پرندے بھی نظر آئے جو انھوں نے اب تک نہیں دیکھے تھے۔ باغ کے ایک گوشے میں خرگوش سبز گھاس ٹونگ رہے تھے کبھی گردن نیچی کر کے تو کبھی گردن اٹھا کر۔

احتشام اس طرف لپکا۔ مگر پلک جھپکتے ہی سارے خرگوش گھنی جھاڑیوں میں جا گھسے۔

ایک اونچے درخت پر عادل چڑھ گیا۔ اور طوطا پکڑنے کے لیے جھولے سے تولیہ نکال کر تھوڑی دور ایک شاخ پر لٹکا دیا پھر جھولے سے گوند کی ایک شیشی نکالی اور ایک موٹی ڈال پر برش سے لگانے لگا۔ بوتل رکھنے کے لیے جب جھولے میں دوبارہ ہاتھ ڈالا تو اندر سے پکے ہوئے دو امرود نکال کر ڈال پر چپکا دیا اور نیچے اتر کر احتشام سے کہا۔'' دیکھو جال بچھا دیا ہے اب خاموشی سے طوطا آنے کا انتظار کرو۔ آؤ ہم دونوں اس پیڑ کے پیچھے چھپ جائیں آج کل کے پرندے بہت سیانے ہو گئے ہیں۔

احتشام جو یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا، اب اس سے نہیں رہا گیا اور اس نے کچھ برا مانتے ہوئے کہا'' دیکھو عادل! کل ہم پرندوں کے گم ہو جانے کی بات کر رہے تھے اور تم نے ان سے پیار بھی جتایا تھا۔ اب تم اپنے پنجرے کی رونق کے لیے ایک آزاد پرندے کو قید کر لینا چاہتے ہو، کیا یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں؟''

عادل ایک لمحے خاموش رہا، پھر بولا'' مگر میں اس کا بہت خیال رکھوں گا۔''

'' کیا خیال رکھو گے؟ دانہ پانی دیتے رہو گے، جو آزاد رہ کر بھی وہ حاصل کر سکتا ہے تمھارا طوطا مر گیا، کیا خبر اسے پنجرے کی گھٹن ہی نے مار دیا ہو۔'' احتشام نے کہا۔

عادل سکتے میں آ گیا۔ پھر اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا اور دوبارہ پیڑ پر چڑھ گیا۔ پیڑ پر چڑھ کر اس نے اپنے پھیلائے جال کو نوچا اور نیچے پھینک دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک بڑے گناہ سے بچ گیا ہے۔

National Council for Promotion of Urdu Language ★ New Delhi ★
Acc No. 5182
15/02/08

پتہ:
R. B. Menzil, Jahangiri Mohalla, Asansol - 713302 (West Bengal)

امپھال کے مقامی فنکار ایک مقامی کلچرل شو پیش کرتے ہوئے۔

اس موقع پر ایک اردو ڈراما بھی پیش کیا گیا۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication . 24/11/2007

URDU DUNIYA Monthly, December 2007, Vol. 9, Issue: 12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

امپھال کے فنکار ایک اور مقامی کلچرل شو پیش کر رہے ہیں۔

امپھالی لڑکیوں نے اپنی دلکش آوازوں میں میر، غالب اور بہادر شاہ ظفر کی غزلیں سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔
جناب نارا سنگھ مائک ہاتھ میں لیے ہوئے لڑکیوں کا تعارف کرا رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک:8، ونگ:7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938